احمد ندیم قاسمی
میرے ہمسفر

میرے ہم سفر

عقابی کتب خانہ
ریختہ سپیشل
معمولی معاوضہ پر
ریختہ کی نایاب
کتب

میرے ہم سفر

(سوانحی خاکے)

احمد ندیم قاسمی

ساقی بک ڈپو، دہلی

Mere Humsafar
-Ahmed Nadeem Quasmi

ISBN 81-85772-39-8

کتاب : میرے ہم سفر (سوانحی خاکے)

اہتمام : منصورہ احمد (اساطیر)

سرورق : شاہنواز زیدی

کمپوزنگ : طارق محمود کمپوزنگ سنٹر،

مطبع : فائن آفسیٹ پریس، دہلی

سنہ اشاعت : ۲۰۰۳ء

قیمت : ۲۰۰ روپے

ناشر

ساقی بک ڈپو

4157-A اردو بازار، دہلی-110006

منصورہ بیٹی کے نام

جو ان تحریروں کی محرک بھی ہے
اور انسپریشن بھی

کہکشاں

سرِ آغاز

بہت مدت تک مجھے اس محبت بھرے مطالبے کا سامنا رہا کہ میں اپنے سوانح لکھوں۔ دراصل میرے طبقے کے ہر فرد کی طرح میری زندگی بھی نشیب و فراز سے اَٹی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا مفصل بیان نہ صرف دلچسپ ہوتا بلکہ تحریکِ خلافت، تحریکِ آزادی، تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے بعد بیشتر سیاست دانوں کی سیاست بازیوں اور پھر ہماری افواج کے بعض سربراہوں کی یلغاروں کی تاریخ بھی مرتب ہو جاتی کہ مجھے انفرادی اور اجتماعی سطح پر سچ بولنا بھی آتا ہے۔ افسوس کہ میرے معمولاتِ حیات میں سے اس کام کے لیے وقت ہی نہ نکل سکا۔ میں نے ایک بار اپنے حالاتِ زندگی کے نوٹ لینا شروع کیے تو میرے بچپن کے ابتدائی نو دس برسوں کی یادیں بھی ایک سو صفحات پر محیط ہوتی محسوس ہوئیں۔ یوں میں اپنی خودنوشت تحریر کرنے کے ارادے سے دستکش ہو گیا۔

اس دوران میری بیٹی منصورہ احمد نے ایک قابلِ عمل تجویز پیش کی۔ اس نے کہا کہ آپ نے اپنی طویل زندگی میں علم و ادب اور شعر و فن کی اہم شخصیات کے ساتھ خاصا طویل وقت گزارا ہے۔ جب آپ ان شخصیات سے متعلق اپنی یادوں کو سمیٹیں گے تو بالواسطہ طور پر خود اپنے سوانح کے بعض حصوں کا بھی ذکر

کرتے چلے جائیں گے اور یوں عصرِ حاضر کے ادب کو دوگونہ فوائد حاصل ہوں گے۔ بیٹی کی یہ تجویز میرے دل کو لگی۔ پھر اس سے قبل میں رسالہ ''نقوش'' کے 'شخصیات نمبر' میں اپنے محسن مولانا عبدالمجید سالک اور اپنی بہن ہاجرہ مسرور کے خاکے لکھ چکا تھا' چنانچہ میں نے اس نتیجہ خیز تجویز کو عملی صورت دینے کا تہیہ کر لیا۔

میں نے اپنے پیارے اور محترم دوست سعادت حسن منٹو کی شخصیت پر ایک مضمون لکھا جو حیرت انگیز اور مسرت بخش حد تک مقبول ہوا۔ اس کے بعد میں نے ن۔م۔راشد' فیض احمد فیض' سید امتیاز علی تاج' سید ضمیر جعفری' ابنِ انشا' خدیجہ مستور' محمد طفیل اور سجاد سرور نیازی کی شخصیتوں کو سمیٹا۔ مجھے مولانا غلام رسول مہر' مولانا چراغ حسن حسرت اور حکیم محمد سعید کا بھی کسی حد تک قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا چنانچہ ان کے بارے میں بھی اپنے تاثرات سپردِ قلم کیے اور یوں میں تیرہ اہم شخصیات کے یہ خاکے ''میرے ہمسفر'' کی صورت میں یک جا کرنے میں کامیاب ہوا۔

اس سلسلے کی دوسری جلد ایسی ہی مشہور و مقبول شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ہوگی۔ ان کی تعداد بیس کے لگ بھگ ہے اور میں نے ان میں سے بیشتر کے بارے میں اپنی یادیں تحریر بھی کر رکھی ہیں۔ یہ مجموعہ بھی اِنشاء اللہ جلد شائع ہو جائے گا۔

احمد ندیم قاسمی

میری رائے میں----

ایک عرصے سے مجھ پر دباؤ تھا کہ میں بابا کو اپنی خودنوشت سوانح لکھنے پر قائل کروں۔ یہ مطالبہ محبت کا تھا مگر اسے سبوتاژ بھی محبت نے ہی کیا۔ اس سلسلے میں جو بہت سا وقت اور توجہ کا ارتکاز درکار تھا وہ ہزار منصوبہ سازیوں کے باوجود کبھی میسر نہ آ سکا۔ تقریباً تین چوتھائی صدی پر پھیلا ہوا یادوں کا تسلسل ہمیشہ ملاقاتیوں کے ہجوم، فلیپ، دیباچوں اور صدارتوں کے دباؤ سے شکست کھا جاتا۔ سب خودنوشت کی اہمیت تسلیم کرتے تھے مگر اپنی اپنی کتاب کے فلیپ، دیباچے اور صدارتی خطبے کے بعد ---- نتیجتہً دو برس کی ناکام جدوجہد کے بعد ہم نے ہار مان لی اور اپنی شکستِ فاش کا اعلان بھی کر دیا۔ اس کے بعد مختلف مشورے ملے۔ مثلاً یہ کہ میں بابا کی بتائی ہوئی خاص اہم باتیں لکھ لیا کروں۔ یہ مشورہ میری افتادِ طبع اور مصروفیات کے سبب ناقابلِ عمل تھا۔ اپنے پبلشنگ ادارے اساطیر کے انتظام و انصرام، 'فنون' کی ادارتی مصروفیات اور ایک بھرے خاندان کی ذمہ داریوں کے بعد اِتنا وقت کہاں بچ پاتا کہ میں نوٹس لے سکوں۔ پھر ایک اہم مسئلہ میرے اور بابا کے اندازِ بیان کا فرق بھی تھا۔ لہٰذا یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھی۔ اِس کے بعد ایک اور کوشش کی گئی (بہت سے لوگوں کی مشاورت کے بعد) کیسٹ پلیئر اور خالی

کیسٹیں خریدی گئیں تاکہ گفتگو کو ریکارڈ کیا جا سکے اور پھر ہم میں سے کوئی اسے کاغذ پر منتقل کر لے۔ بابا نے اس خیال سے شدید اختلاف کیا اور کہا کہ ان کا لکھنے کا اپنا ایک انداز ہے جس کے لیے ٹیپ ریکارڈر بالکل مددگار نہیں ہو سکتا۔ دو ایک بار خفیہ طور پر کیسٹ ریکارڈنگ آن کی لیکن عین وقت پر بابا کو پتا چل گیا اور منصوبہ ناکام ہو گیا۔

ایک روز بابا منٹو کے حوالے سے اپنا کوئی تجربہ بیان کر رہے تھے کہ مجھے ایک خیال سوجھا کہ خودنوشت کا خیال تو خیالِ خام ہی ثابت ہوا' کیوں نہ ان مشاہیر کے حوالے سے بابا اپنی یادداشتیں قلم بند کر لیں۔ یہ بھی ایک انداز سے جزوی خودنوشت ہی ہوگی---- خیال بابا کے سامنے رکھا تو انھیں پسند آیا۔ لیکن اسے عملی شکل دینے کے لیے مجھے ساڑھے چار برس یاد دہانیاں کرانی پڑیں۔ کبھی بابا کی مصروفیات حائل ہو جاتیں اور کبھی ان کے دلِ نادان کی بغاوتیں جو سانس کی ناہمواری کے ساتھ مل کر تو حشر ہی برپا کر دیتیں۔ بہرحال صحت کے وقفوں میں جو کچھ میں لکھوا سکی آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔

یہ ایک بڑے آدمی کی رائے ہے دوسرے بڑے آدمیوں کے بارے میں۔ اختلاف کا حق یقیناً ہمارے پاس ہے مگر اختلاف کرنے کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ کتاب میں ایسے مقام بھی آئیں گے جن سے آپ کو اختلاف ہو لیکن برائے مہربانی یہ ضرور ذہن میں رکھیے گا کہ علمی متانت اور شائستگی سے کیا گیا اختلاف جذباتی ہاؤ ہُو سے زیادہ خوبصورت اور پائیدار ہوتا ہے۔ گذشتہ دنوں 'معاصر' میں فیض صاحب کے بارے میں بابا کا وہ مضمون چھپا جو اِس کتاب میں بھی شامل ہے۔ اس پر جو ردِعمل دیکھنے اور سننے میں آیا اُس کے جواب میں ایک ردِعمل میرا بھی تھا جو اگلے 'معاصر' میں شائع ہوا۔ وہ اس لیے یہاں درج کر رہی ہوں کہ وہ تمام سوانحی خاکوں پر میرے نظریے کا ترجمان بھی ہے اور اس خصوصی

مضمون پر اُٹھنے والے کچھ اعتراضات کا ایسا جواب بھی جو سبھی سوانحی خاکوں پر منطبق ہوسکتا ہے۔

''معاصر میں ایک سوانحی خاکہ چھپا۔ ۔ ۔ اور ترقی پسندی کے داعی ایک محدود سے حلقے میں بھونچال آ گیا مگر کیوں؟ حالانکہ خاکہ لکھنے والا بھی ترقی پسند' موضوعِ مضمون بھی ترقی پسند اور بھونچال زدہ احباب بھی ترقی پسند۔ ترقی پسندوں نے بہت بلند آہنگی سے انسان کی آزادیِ رائے کا حق مانگا تھا' پھر خود ہی اس پر شب خون مارنے بیٹھ گئے۔ انصاف کا تقاضا جب گھر کی دہلیز تک پہنچے تو پلڑا اکثر ڈول جاتا ہے۔ دیکھیے ایسے سوانحی خاکوں میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ پہلی تجربہ اور دوسری رائے۔ کیا آپ ان دونوں میں سے کسی کو چیلنج کر سکتے ہیں؟ کیا آپ ہدایت نامہ جاری کر سکتے ہیں کہ نہیں قاسمی صاحب ! آپ فلاں کے بارے میں یہ رائے نہ لکھیے۔ آپ کے پاس زیادہ سے زیادہ اختیار اس رائے سے اختلاف کا ہوتا ہے یا اتفاق کا۔ بابا نے فیض صاحب کے بارے میں اپنی رائے دی ہے' ہم آپ کون ہوتے ہیں ان کے درمیان آنے والے۔ ان کا اپنا ایک vintage point ہے جہاں سے وہ فیض صاحب کو دیکھتے ہیں۔ ایک ہم عصر کے طور پر ان کا تجزیہ کرتے ہیں' اس میں بحث کی گنجائش ہی کہاں ہے؟ پھر ہمارے پاس کون سی کسوٹی ہے جس پر ہم بابا کے تجربات کو جھٹلائیں۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی شخص سے دس لوگوں کو مختلف تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ کیا ہمارے پاس کوئی پیمانہ ہے جس کی مدد سے ہم پانچ لوگوں کی تردید اور پانچ کی تائید کریں؟ تو پھر یہ احباب صاحبِ مضمون کو اپنی رائے کے اظہار کے بنیادی حق سے کیوں محروم کرنا چاہتے ہیں؟ یہ تو وہی zero tolerance ہے جس کی شکایت یہ لوگ مولوی سے کرتے رہے ہیں کہ ہر وہ رائے غلط ہے جو ان کی مرضی کے مطابق نہیں۔ عمر اور تجربے کی جس منزل پر یہ لوگ ہیں وہاں یہ رویہ بہت ہی بچگانہ ہے کہ جس کا

سر ہمیں پسند نہیں، اس کا گلا گھونٹ دو۔ اس طرح تو بہت جمود اور سناٹا ہو جائے گا۔ صاحب! سمفنی تو سُروں کا مجموعہ ہے، اسی سے نغمگی ہے۔

میں نے ان تمام احباب کی تحریریں ایک سے زیادہ بار پڑھی ہیں اور ایک سے زیادہ بار ہی حیرت میں مبتلا ہوئی ہوں۔ ان تمام تحریروں کے مطالعے سے مجھ پر مندرجہ ذیل انکشافات ہوئے ہیں:

۱۔ پہلا انکشاف یہ ہوا کہ فیض احمد فیض ماورائے بشریت تھے۔ ان میں کوئی انسانی خامی ہونا ممکن ہی نہیں تھا، بلکہ جو خامی عام انسانی معیاروں سے سامنے آتی ہے وہ دراصل ہماری بصیرت اور بصارت کی خامی ہے۔ منٹو نے کیا خوب کہا تھا کہ مرنے کے بعد ہمارے ہاں عموماً لوگوں کو رحمتہ اللہ علیہ کی کھونٹی پر ٹانگ دیا جاتا ہے، بلکہ ان لوگوں کے کالموں کا رویہ تو اس سے بھی آگے دیہات کے ان مُریدوں کا سا ہے جن کا پیر وڈا سائیں ہر بشری کمزوری سے مبرّا انسانِ کامل ہے۔ کیا فیض پیر وڈا سائیں کی سی بور شخصیت تھے؟ مجھے تو اس مضمون میں ان کی جیتی جاگتی ہنستی مسکراتی شخصیت ملتی ہے جو انسانِ کامل ہونے کی موربڈیٹی میں ہرگز مبتلا نہیں تھی۔ فیض صاحب عالمِ بالا میں اپنے موجودہ سٹیٹس سے سخت پریشان ہوں گے۔ اقتدار کی تنہائی سے بڑی تنہائی کون سی ہوتی ہے؟ پھر یہ بھی بتائیے کہ آخر اس مضمون میں فیض صاحب پر کون سی چوری، رہزنی اور اغوا کا الزام لگا ہے، کچھ نظریاتی فروگزاشتوں ہی کا گلہ ہے نا جو ایک نظریاتی اور آدرش شاعر کے لیے تو بہت عزت کی بات ہے، کہ اس سے اتنی بلندی کی توقع کی گئی تو گلا پیدا ہوا۔ بابا نے فیض صاحب سے گلہ کر کے دراصل انھیں عظمت کا مان دیا ہے۔

۲۔ دوسری fallacy یہ ہے کہ فیض صاحب ہر الزام خاموشی سے سن لیتے تھے اس لیے وہ ایک عظیم صوفی تھے۔ حالانکہ ہر خاموشی صوفیانہ سرمستی کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ ہم بہت دفعہ اس لیے خاموش ہو جاتے ہیں کہ ہمارے پاس کہنے کے

لیے کچھ نہیں ہوتا' اور خاموشی ہی واحد گوشۂ عافیت بن جاتی ہے۔ مثلاً مجھے ایک حیرت ہے کہ ۶۵ء اور ۷۱ء کی جنگوں میں جب روسی ساخت کے طیارے میرے ہم وطنوں کی زندگیوں سے کھیل رہے تھے تو فیض صاحب اپنے ممدوح روس اور اس کے حلیف بھارت کی بہیمت کی مذمت میں ایک لفظ بھی کیوں نہیں بولے؟ ہم فاشزم کی مخالفت کے دعویدار دانشور کی اس خاموشی کو تصوّف کے کس کھاتے میں ڈالیں؟ دوسری یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ فیض صاحب کی خاموشی کے معتقدین اس ضمن میں خود ان کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

۳۔ ایک دلچسپ fallacy یہ بھی سامنے آئی ہے کہ شراب پینا بُری بات نہیں' اس کا ذکر کرنا بُری بات ہے۔ یہ عجیب مضحکہ خیز تضاد ہے کہ یہ احباب شراب پیتے بھی ہیں اور اسے بُرا بھی سمجھتے ہیں۔ جبکہ اس سلسلے میں بابا کی اپروچ بہت غیر جانبدار ہے۔ وہ کبھی اخلاقیات کے ٹھیکیدار نہیں بنے۔ ان کے بہت سے دوست پینے کے شائق ہیں لیکن ان کا یہ شوق کبھی ان کی اور بابا کی محبت پر اثر انداز نہیں ہوا۔ اب اسی مضمون کو دیکھ لیجئے۔ پورے مضمون میں شراب کے حوالے سے فیض صاحب کا Image بہت خوشگوار صورت میں اُبھرتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو بہت پینے کے بعد بھی لڑکھڑاتا نہیں' بدحواس نہیں ہوتا بلکہ زیادہ خوبصورت گفتگو کرنے لگتا ہے۔ اس صورتِ حال میں میرے بزرگوں کو اعتراض کیا ہے؟ میرا خیال ہے ان کا اعتراض بھی وہی ہے جو STN والوں نے گلزار صاحب کی ٹیلی فلم سیریل ''مرزا غالب'' پر کیا تھا کہ اس میں غالب کو شراب پیتے ہوئے کیوں دکھایا گیا ہے۔

۴۔ چوتھا دلچسپ انکشاف یہ ہے کہ بابا نے فیض صاحب کے یومِ وفات پر اپنی سالگرہ منائی۔ میرے مہربانوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ سالگرہ کا دعوت نامہ

چار پانچ روز پہلے دیا جاتا ہے جبکہ کسی کی موت کی پیش گوئی چار پانچ دن پہلے نہیں کی جا سکتی۔ بابا کی سالگرہ حالانکہ پہلے سے طے شدہ تھی اور آنے والے دوسرے شہروں سے بھی آئے تھے۔ پھر بھی فیض صاحب کی تدفین کے بعد ہی وقت مقررہ پر آ کر بابا نے سب سے معذرت کی اور کھانا کسی اور وقت پر موخر کر دیا۔ یہ تھی کُل سالگرہ۔ لیکن معترض صاحب اس سوال کا جواب دیں کہ وہ فیض صاحب کو دفنانے کے بعد اس ریستوران میں کیا کرنے آئے تھے؟

۵۔ پانچواں انکشاف یہ ہے کہ یہ یادداشتیں لکھنے کے لیے بابا نے فیض صاحب کی موت کا انتظار کیا۔ کیا کہنے! اتنا انتظار تھا تو موت کے بعد تیرہ برس کیا کرتے رہے؟ ہم بہت دِنوں سے بابا کو خودنوشت لکھنے کی تحریک کر رہے تھے۔ جب دیکھا کہ ان کی مصروفیات اس کی اجازت نہیں دے رہیں تو متبادل مشورہ دیا کہ آپ اہم شخصیات کے بارے میں لکھیں۔ اس طرح ہی اَدب کی کچھ تاریخ محفوظ ہو جائے گی۔ یہ مضمون دراصل میرے ادارے ''اساطیر'' سے شائع ہونے والی کتاب ''میرے ہم سفر'' کا ایک حصہ ہے جو لفظ لفظ اسی طرح اپنے معنوی اور فنی محاسن اور سچائیوں سمیت کتاب اور تاریخ کا حصہ بنے گا اور ایک یہی کیا حقیقت اور مفروضہ حقیقتوں کے درمیانی نقطے پر ابھی اور بہت سے سوال اُٹھیں گے۔ وقت کا شہ زور گھوڑا بہت سفاک ہے۔ کمزور اور غیرحقیقی چیزیں اس کے سُموں تلے روند دی جاتی ہیں۔

منصورہ احمد

مولانا عبدالمجید سالک

شروع ہی میں بتا دوں کہ میں سالک صاحب کی شخصیت کو ان چند صفحات میں سمیٹنے سے قاصر رہوں گا۔ اس عجز کے اعتراف ہی میں خیریت کیونکہ جس شخصیت میں مشرق کا کلچر مجسّم ہوگیا ہو' اس کا کماحقہٗ احاطہ کرنا میرے بس کی بات نہیں اور جس طرح ایشیائی کلچر کی اَن گنت' ایک سے ایک دلآویز اور موتیوں کی طرح جگمگاتی ہوئی پرتیں ہیں' اسی طرح سالک صاحب کی شخصیت کے بھی بے شمار پہلو ہیں اور اگر میں ان سب کا ذکر کرنے بیٹھوں گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کر رہا ہوں۔

شعر و افسانہ کی دنیا میں میرے ذہن نے جو بھی موضوع سوچا ہے' اس سے میں نے بہت کم شکست کھائی ہے۔ میں نے موضوع کو فنی تخلیق پر کبھی مسلط نہیں ہونے دیا بلکہ میری کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ میں تخلیق کے دودھ میں موضوع کو کھانڈ کی طرح کھول دوں۔ مگر میں سالک صاحب کی شخصیت کا ایک ذرا سا پرتو پیش کرنے کے تصور ہی سے کانپ رہا ہوں۔ اس موضوع اور میرے تخلیقی جذبے کے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہے اور یہ فاصلہ اُفق تا اُفق کا نہیں' فراز و نشیب کا فاصلہ ہے۔ آپ کہیں گے' یہ ندیم نہیں بول رہا ہے' ندیم کی بے پناہ

عقیدت بول رہی ہے۔ آپ نے صحیح اندازہ لگایا ہے اور سالک صاحب کے متعلق کچھ لکھتے ہوئے میرے قلم کی روانی کو اسی عقیدت نے جکڑ رکھا ہے۔

سالک صاحب کے اور میرے درمیان عقیدت و شفقت کا رشتہ تھا۔ عقیدت میری اور شفقت ان کی۔ اور طویل عرصے تک نہ تو میری عقیدت میں کوئی کمی آئی اور نہ ان کی شفقت میں۔ حالانکہ ہماری راہیں عموماً الگ الگ رہیں بلکہ اکثر اوقات ہم دو قطعی مخالف راہوں پر گامزن رہے۔

میں مولانا ظفر علی خاں کے نیلی پوشوں میں شامل تھا' کیونکہ مولانا نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ مسجد شہید گنج کے حصول کی خاطر نیلی پوش ہو جاؤ۔ ''خدا کا نام لو اور عاقبت بردوش ہو جاؤ۔'' میں نے سفید لٹھے کی تنہا قمیص کو نیلے رنگ میں ڈبو لیا اور بزعمِ خود غازی بنا لاہور کی سڑکوں پر ٹہلتا رہا مگر نیلی پوشوں کے معاملے میں سالک اور مہر کے ''انقلاب'' کا رویہ کچھ ایسا ہمدردانہ نہیں تھا۔ میرا عنفوانِ شباب تھا۔ رائے کے ذرا سے اختلاف کو دشمنی قرار پا جانا چاہیے تھا مگر سالک صاحب سے میری عقیدت بدستور رہی (اس وقت یہ عقیدت غزل کے چند اشعار ''چترا'' کے ترجمے اور ''افکار و حوادث'' کے کالم تک محدود تھی)۔ پھر میں نے اس علاقے میں مسلم لیگ کا پرچم بلند کیا جس کی نمائندگی صوبائی اسمبلی میں ملک خضر حیات خان ٹوانہ کر رہے تھے۔ ملک صاحب پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے اور ''انقلاب'' ملکی پیمانے پر مسلم لیگ کا ہمنوا ہونے کے باوجود صوبائی مسائل پر ملک صاحب کی یونینسٹ پارٹی کا مؤید تھا۔ پنجاب میں قائداعظم کی تشریف آوری کے بعد ان سے ملک خضر حیات خان کے شدید اختلاف اور ''انقلاب'' کی یونینسٹ حکمتِ عملی ملک بھر میں ہدفِ طعن بن رہی تھی اور خود مجھے بھی ''انقلاب'' کی صوبائی پالیسی کے لفظ لفظ سے اختلاف تھا مگر سالک صاحب سے میری عقیدت مندی میں شمہ بھر بھی فرق نہ آیا (اُس وقت تک میں سالک

صاحب کی شخصیت سے بھی متعارف اور متاثر ہو چکا تھا)۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب ترقی پسند ادب کی تحریک زوروں پر تھی اور بعض علما کا واحد وظیفۂ حیات یہ رہ گیا تھا کہ وہ ترقی پسند ادیبوں کے خلاف نت نئے فتوے جاری کریں۔ پھر جب اس رَو میں سالک صاحب کے اور میرے بعض مشترک احباب بھی بہہ گئے اور انہوں نے میرے نظریۂ فن سے اختلاف کی وجہ سے مجھے نئی نئی گالیوں سے بھی نوازا' اور جب خود سالک صاحب کے بیٹے اور میرے دوست مسٹر عبدالسلام خورشید کو بھی اس ادبی انجمن سے متعدد اختلافات پیدا ہو گئے جس کا میں سیکرٹری تھا' تو سالک صاحب نے علی الاعلان میرا' یعنی انجمنِ ترقی پسند مصنفین کا ساتھ دیا۔ ڈاکٹر تاثیر ان کے پرانے دوست اور میرے کرم فرما تھے۔ (میرے قطعات کے مجموعے کا مختصر سا مگر خوبصورت ابتدائیہ انھی نے لکھا تھا) مگر سالک صاحب نے صاف لفظوں میں انہیں غیرت دلائی کہ ماضی میں ترقی پسندوں کے ایک اہم رہنما ہونے کے باوجود آپ ان کی مخالفت کرتے بھلے نہیں لگتے۔ چنانچہ سالک صاحب سے میری عقیدت کا وہی عالم رہا۔ اس سارے سلسلۂ واقعات کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ حکومت نے مجھے چھ مہینے کے لیے تدارکی نظر بندی کے تحت جیل بھیج دیا اور سالک صاحب ''انقلاب'' کے بند ہو جانے کے بعد کسی سرکاری محکمے سے منسلک ہو گئے۔ لیکن جب میں رہا ہوا تو سب سے پہلے جس شخص نے میرے گھر آ کر مجھے اپنے سینے سے لگایا وہ سالک صاحب ہی تھے۔ پھر میں سالک صاحب کی طرح ایک روزنامے کا ایڈیٹر ہوا اور سالک صاحب میری طرح گھر میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ہم مہینوں ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے تھے لیکن اگر اس عالم میں بھی کوئی مجھے یہ بتاتا کہ سالک صاحب کچھ عرصے کے لیے لاہور سے باہر جا رہے ہیں تو میں اُداس ہو جاتا اور میرے لیے لاہور ایک دم خالی ڈھنڈار ہو کر رہ جاتا۔

"میری عقیدت کا معیار ہمیشہ وہی رہا اور اس کے ساتھ ہی سالک صاحب کی شفقت کا بھی۔

اکیچ ایسی محدود صنف ادب اتنی طویل تمہید کی یقیناً متحمل نہیں ہو سکتی لیکن یقین کیجیے کہ یہ خالی خولی تمہید نہیں۔ سالک صاحب کی شخصیت کے ایک نہایت دلآویز رخ کا ایک ایسا اظہار تھا جس میں راقم الحروف کی "میں" کو ان تمام افراد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے جو سالک صاحب سے متعارف تھے اور جنھوں نے اس ازلی و ابدی مسکراہٹ کو قریب سے دیکھا جسے میں نے صرف ایک بار ان کے ہونٹوں سے غائب پایا تھا۔

یہ ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے۔ میں "نروس بریک ڈاؤن" کا مریض تھا۔ اچانک پسینے چھوٹ جاتے۔ ہاتھ پیر سن ہونے لگتے اور میں "حاضرین" کو وصیت تک کر دیتا۔ سالک صاحب نے میری حالت دیکھی تو دفتر سے اٹھے۔ مجھے چیمبرلین روڈ کے چوک میں حکیم دینا ناتھ کوہلی کے یہاں لے آئے اور انہیں میرے مرض کی کیفیت بتانے کے بعد کہا کہ "اگر آپ نے ندیم کو تندرست نہ کیا تو میں "انقلاب" میں آپ کو نیم حکیم خطرہ ناتھ دہلی لکھ دوں گا۔" حکیم صاحب ادب دوست اور باذوق بزرگ تھے۔ میرا معائنہ کیا اور اچانک چونک کر سالک صاحب سے کہا "ندیم کا دل دس بارہ ضربوں کے بعد ایک ضرب "مس" کر جاتا ہے۔" اور اس وقت میں نے سالک صاحب کی ازلی و ابدی مسکراہٹ کو ان کے ہونٹوں سے غائب ہوتے دیکھا۔ الگ جا کر دونوں بزرگ کچھ کھسر پھسر کرتے رہے۔ واپس آئے تو دونوں مسکرا رہے تھے۔ دونوں نے مجھے بہلانے کی کوشش کی۔ حکیم صاحب نے کہا "جس چیز کے لیے جی چاہے وہی کھاؤ۔ البتہ دال مت کھاؤ۔ دال ہم لالاؤں کا کھاجا ہے۔ اسے ہمارے لیے رہنے دو۔"

ہم مطب سے باہر نکلے تو چند بچے مسلم لیگ کے جھنڈے اٹھائے

نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ سالک صاحب نے حکیم صاحب سے کہا ''آج کل تو جسے دیکھو آپ کے ہری چند اختر کو بانس پر اٹھائے پھرتا ہے۔''

حکیم صاحب نے لطیفے سے محظوظ ہونے میں دیر لگائی تو سالک صاحب نے بتایا کہ جھنڈا ہرا (ہری) ہے اور اس پر چاند (چند) ستارے (اختر) کا نشان ہے اور ---- ''ظالم اب تو ہنس دو!''

اور میں اپنی آدھی بیاری وہیں کہیں راستے ہی میں جھٹک آیا۔

سالک صاحب کی محبوبیت' ان کا خلوص' ان کی فراخ دلی' وسیع المشربی اور نیک نیتی ان کی اسی مسکراہٹ میں سمٹ آئی اور یہی مسکراہٹ ان کا کردار تھا اور جب یہ مسکراہٹ لمحے بھر کے لیے غائب ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ان پر کوئی حادثہ گزر گیا ہے۔ ان ''حادثوں'' کی نوعیت کیا ہوتی تھی؟ اس کی ایک جھلک تو اوپر کے واقعے میں موجود ہے مگر ایک مثال اور بھی سُن لیجیے۔

آغا شورش کاشمیری نے ایک بار ایک جلوس کی رہنمائی کرتے ہوئے دفتر ''انقلاب'' پر ہلّہ بول دیا اور انقلاب کے دفتر اور پریس میں کچھ دیر تک توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری رہا۔ چند روز کے بعد حکومت نے شورش صاحب کو نظر بند کر دیا۔ جب سالک صاحب کو ان کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو ان کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی اور وہ بولے ''یہ حکومت کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ شورش ذرا سا جذباتی ضرور ہے مگر جذباتیت پر تو غصے کے بجائے پیار آنا چاہیے۔ اور بدذوق حکومت کو شورش پر ہمیشہ غصہ ہی آتا ہے' پیار کبھی نہیں آیا۔''

پھر ایک بار جب شورش کاشمیری کو ایک مقدمے کا سامنا تھا اور عدالت نے ضمانت کے لیے ایک معتبر ضامن طلب کیا اور سالک صاحب کو اس کی اطلاع ملی تو وہ فوراً عدالت میں پہنچے اور اُن شورش صاحب کی ضمانت دے دی جن کا جلوس اس سے پہلے سالک صاحب کے اخبار کے پریس کی مشینوں کو

نقصان پہنچا چکا تھا!

اور یہ مبالغے کی حد تک وسیع القلبی اور نرم دلی صرف ان لوگوں کے لیے مخصوص نہ تھی جو سالک صاحب سے متعارف تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ایک عجیب الخلقت پھٹے حال بزرگ دفتر انقلاب میں آئے اور بتایا کہ وہ ضلع کوزگاؤں کے کسی گاؤں کے باشندے ہیں۔ ان کا بیٹا پٹوار کی تربیت حاصل کر رہا تھا کہ اچانک اسے جواب مل گیا اور وہ چاہتے ہیں کسی خدا ترس اور منصف مزاج افسر سے ان کے بیٹے کے حقوق کا لحاظ رکھنے کی درخواست کی جائے---- ظاہر ہے کہ عام حالات میں ایسے لوگوں کو ٹالا جاتا ہے، مگر سالک صاحب اٹھے، چھڑی ہاتھ میں لی، سائل کو ہمراہ لے کر تانگے میں بیٹھے اور سیکرٹریٹ میں جا کر اس وقت تک وہاں سے نہ ہلے جب تک اس بزرگ کو بیٹے کی ٹریننگ کی اجازت نہ لے دی۔

میں بھی سالک صاحب کی اس خدا ترسی کو ایک آزمائش میں ڈالنے کا گنہگار ہوں۔ خود سالک صاحب کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ ایک بار میرے ایک قریبی عزیز سالک صاحب سے کوئی سفارش حاصل کرنے کے لیے میرے پاس آئے۔ کام ایسا بھونڈا سا تھا کہ میں سالک صاحب کے سامنے اس کا ذکر کرتے ہوئے جھجکتا تھا۔ مزاروں، مجاوروں کا کوئی قصہ تھا اور سالک صاحب نے ''پیر افکار شاہ'' کی حیثیت سے مسلمانوں کی قبر پرستی پر بڑی زبردست چوٹیں کی تھیں۔ سو میں نے ایک ترکیب سوچی۔ اپنے عزیز سے کہا کہ میں سالک صاحب کو بلاناغہ ایک نہ ایک کام کہتا ہوں۔ آج کا ''کوٹا'' آپ کے آنے سے پہلے پورا ہو چکا ہے مگر میں نے سنا ہے کہ سالک صاحب سے امداد حاصل کرنے کے لیے کسی تعارف کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ آپ سیدھے ان کے پاس چلے جائیے، یہ بھی نہ بتائیے کہ آپ میرے رشتہ دار ہیں۔ اپنی مظلومیت کا ذکر کیجیے

اور پھر دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

میرے عزیز دفتر ''انقلاب'' میں گئے اور دو تین گھنٹے تک واپس نہ آئے۔ میں نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ سالک صاحب دو تین گھنٹے پہلے کسی شخص کے ساتھ اٹھ کر چلے گئے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد میرے عزیز واپس آئے اور معلوم ہوا کہ سالک صاحب نے ان سے بے انتہا ہمدردی کی۔ پہلے فون کیا، لیکن جب انہیں محسوس ہوا کہ فون پر انہیں ٹرخانے کی کوشش کی گئی ہے تو وہ انہیں ساتھ لے کر متعلقہ افسر کے پاس پہنچے اور کام کرا کے اٹھے۔ جب واپس آنے لگے تو اس افسر نے سالک صاحب سے کہا ''کام تو میں نے کر دیا مگر قبلہ! مجھے یہ وہم بھی نہ تھا کہ آپ ایسے معاملات میں بھی دلچسپی لے سکتے ہیں۔'' اور سالک صاحب نے مسکرا کر کہا ''یہ تو ایک بزرگ کے مزار کا معاملہ تھا اور بعض لوگ تو میرے پاس اپنے محلّے کی مسجد کے لیے سستے داموں پر مٹی کے ڈھیلوں کا انتظام کرانے بھی آ نکلتے ہیں!''

سالک صاحب کے پاس اس قسم کے ضرورت مندوں کا ہمیشہ تانتا لگا رہتا تھا اور جب وہ ایک حد تک گوشہ نشین بھی ہوگئے تو بھی ضرورت مند انہیں جا ہی لیتے تھے اور اگر ضرورت معقول ہوتی (یعنی مٹی کے ڈھیلوں کی سی ضرورت نہ ہوتی) تو حسبِ عادت ان کے ساتھ چل کھڑے ہوتے۔ بلکہ بعد میں انہوں نے موٹر کار بھی خرید لی تھی اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ تکلف بھی انہوں نے محض اس لیے کیا کہ لاہور سے ان کے پاس مسلم ٹاؤن آنے والوں کو واپسی میں تکلیف نہ ہو۔

''ضرورت مندوں'' کی ایک اور قسم کا بھی ان کے اردگرد ہمیشہ ہجوم رہا۔ یہ ادب وفن، شعر ونغمہ اور لطافت و جمال کے ''ضرورت مند'' تھے اور سالک صاحب کی انجمن آرائی ربع صدی کی علمی و ادبی دُنیا کی ایک حقیقت بن چکی

تھی۔ جس محفل میں بیٹھے آن کی آن میں جان محفل بن گئے اور گفتگو صرف لطیفے اور پھبتی تک محدود نہیں تھی بلکہ دنیا جہان کا کوئی سا موضوع چھڑتا تو :

اک ذرا چھیڑیئے' پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

کی سی صورت پیدا ہو جاتی۔ معلومات کا ایک دریا رواں ہو جاتا اور پھر یہ بھی نہیں کہ ان معلومات میں علم کی خشکی یا ضرورت سے زیادہ سنجیدگی کی پبوست راہ پا جائے۔ سالک صاحب بنیادی طور پر فن کار تھے اور اگر چہ اُردو صحافت میں ان کا درجہ بہت بلند تھا مگر وہ اول و آخر شاعر تھے اور یہی وجہ تھی کہ بات تاریخ کی ہوتی یا فلسفے کی' نفسیات کی ہوتی یا جغرافیے کی' سائنس کا کوئی موضوع ہوتا یا سیاسیات کا' توحید کا ذکر ہو رہا ہوتا یا الحاد کا' ان کی گفتگو کی ادبی چاشنی برقرار رہتی۔ ایک بار سائنس کی ترقی کا ذکر چلا۔ سائنس کی ترقی کو ماقبل تاریخ کے دور سے شروع کیا اور جب وہ اٹھارویں انیسویں صدی تک آئے تو (مجھے نام یاد نہیں) کسی ایسے سائنس دان کا ذکر کر رہے تھے کہ جس نے اپنی تحقیقات تو مکمل کر لی تھیں اور وہ ایجاد کی حدود تک بھی پہنچ گیا تھا مگر وہ اپنی ایجاد کو مناسب انداز میں اہل قلم کے سامنے پیش نہ کر سکا اس لیے کسی نے اس پر اعتماد نہ کیا اور تمام عمر اسے یہی حسرت رہی کہ وہ ایجاد کرنے کے باوجود موجد نہ کہلا سکا۔ اسی سلسلے میں سالک صاحب نے کہا کہ سائنس دان کی کیفیت میرزا بیدل کے اس شعر کی سی تھی :

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنج خمارِ ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما

ایک بار ترقی پسند ادب کی تحریک کا ذکر چلا تو کہنے لگے کہ ''تاریخ کے ہر دور میں اپنے زمانے سے کچھ آگے بڑھ کر سوچنے والے اور اپنے وقت کے نقائص پر بے برقرار ہو جانے والے موجود رہے ہیں۔ دور کیوں جاؤ' یہی دیکھ لو

کہ ذوق کے زمانے میں غالب بھی موجود ہے اور امیر مینائی کے زمانے میں حالی کی آواز بھی آ رہی ہے اور نوح ناروی کے وقت میں اقبال کا نغمہ بھی گونج رہا ہے۔ اور پھر یہ تو اب کی بات ہے۔ آج سے چار صدی پہلے فیضی وہی بات کہہ گیا ہے جسے تم لوگ قطعی نئی بات سمجھ کر اس پر اپنے فن کی تعمیریں اٹھا رہے ہو۔ دیکھو، فیضی کی یہ رباعی دسویں صدی ہجری کی پیداوار معلوم ہوتی ہے یا تمہاری چودھویں صدی ہجری کی:

ما عقل بہ صد جام لبا لب ندہیم
یک پرتو دل بہ سبعہ کواکب ندہیم
با ما ز فروغِ شب مہتاب مگو!
ما یک دم صبح را بہ صد شب ندہیم

ساتھ ہی جب سالک صاحب شگفتگی کے موڈ میں آ جاتے (آ جانے کا جھگڑا ہی نہیں بلکہ ان کے مزاج کی شگفتگی سدا بہار تھی) تو پھر وقت پر بڑا غصہ آتا جو گزرا جا رہا تھا اور جب یہ محفل، جسے قیامت تک برپا رہنا چاہیے، منتشر ہو جائے گی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ سالک صاحب نے اپنے دفتر میں چھڑکاؤ کرا رکھا تھا، چقیں گرا رکھی تھیں اور چھوٹے سے کمرے میں گرمی کا نشان تک نہ تھا۔ محفل میں دو ہندو بزرگ بھی بیٹھے تھے اور بے تعصبی اور فراخ دلی کے موضوع پر باتیں ہو رہی تھیں۔ سالک صاحب تاریخی حوالوں سے مسلمانوں کی بے تعصبی کا ذکر کر رہے تھے۔ اچانک چق اٹھی اور دو نوجوان طالب علم اندر آئے۔ آتے ہی انہوں نے اطمینان کی لمبی لمبی سانسیں لیں اور ان میں سے ایک بولا ''مولانا آپ نے تو اپنے دفتر کو بالکل جنت بنا رکھا ہے۔'' سالک صاحب نے فوراً کہا ''تشریف رکھیے۔ اب جنت بالکل مکمل ہو گئی ہے۔ صرف غلمان کی کمی تھی۔''

محفل کا رنگ بدلا تو ایک ہندو بزرگ کو سالک صاحب سے مذاق کرنے کا شوق چرایا۔ بولے ''ہندوؤں اور سکھوں کی بے تعصبی کی ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ اُردو کے مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی نے اپنے ایک افسانے میں لکھا ہے کہ دو پوسٹ مین (ایک ہندو اور ایک مسلمان) آپس میں حکام کی بد دیانتوں کا ذکر کر رہے تھے۔ جب مسلمان پوسٹ مین نے کہا:

''چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟''

تو ہندو پوسٹ مین نے فوراً کہا: ''تمہیں بے چاری مسلمانی کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ بھابھی کو میرے ہاں بھیج دینا۔''

زور کا قہقہہ پڑا اور پھر سالک صاحب نے فوراً کہا ''اور لالہ جی! آپ نے علامہ اقبال کا یہ مصرع نہیں سنا:

''عروسِ لالہ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب''

ہندو بزرگ نے ہاتھ تک جوڑ دیے مگر سالک صاحب کی طرف سے ''لالہ'' کے سلسلے میں اُردو فارسی کے اشعار کا سلسلہ رُکنے ہی میں نہ آتا تھا۔ اچانک ساتھ کے کمرے سے مہر صاحب کی آواز آئی ''سنیے تو سالک صاحب! میرے پاس ضلع راولپنڈی کے ایک صاحب بیٹھے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ گاندھی جی نے سنہ انیس سو سنتری (۴۷) میں فلاں تقریر کی تھی۔ یہ 'سنتری' کیا ہوتی ہے؟'' اور سالک صاحب نے فرمایا ''یہ سنتر کی بیوی ہوتی ہے!''

آج سے کئی برس پہلے میں دارالاشاعت پنجاب میں ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' مرتب کرتا تھا اور دفتر ''انقلاب'' بھی دارالاشاعت والی سڑک پر ہی واقع تھا۔ سالک صاحب کا معمول تھا کہ شام کو چار بجے کے قریب جب وہ دفتر سے اٹھتے تو میرے پاس تشریف لے آتے۔ میرے کمرے میں ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' کے خوشنویس منشی فرزند علی اور منشی تہور علی بھی بیٹھتے تھے اور

یہ دونوں اس ادارے میں اُس وقت سے کام کر رہے تھے جب شمس العلما مولوی ممتاز علی مرحوم کی زندگی میں سالک صاحب "پھول" اور "تہذیب" کے ایڈیٹر تھے۔ اس لیے سب ایک دوسرے کے پرانے مزاج داں تھے۔ سالک صاحب کمرے میں آتے ہی فرماتے "چپراسی سے کہو کہ دتّی والے کی چاٹ کی چار پلیٹیں لے آئے۔" ہم چاٹ پر جھپٹتے تو سالک صاحب چپراسی سے کہتے "چار پلیٹیں قلفی کی بھی تو لے آؤ۔" پھر قلفی کی چار پلیٹوں کا صفایا کیا جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں اور سالک صاحب بل ادا کر کے مسلم ٹاؤن روانہ ہو جاتے۔ دو تین مہینے تک یہی سلسلہ جاری رہا تو میں نے اپنے خوشنویسوں سے مشورہ کیا کہ آخر کب تک ہم سالک صاحب پر بوجھ بنے رہیں گے۔ وہ ہم پر ماہانہ کئی روپے خرچ کیے جا رہے ہیں اور یہاں اپنی تنخواہ ہی سَتر پچھتّر تھی۔ طے پایا کہ ہم تینوں اپنی اپنی تنخواہوں میں سے کچھ رقم نکال کر الگ رکھ لیا کریں اور چاٹ اور قلفی کے اخراجات کا نصف اپنے ذمے لے لیں۔ مجھ میں تو اتنی جرأت نہیں تھی کہ سالک صاحب پر اپنی "سازش" کا انکشاف کرتا۔ منشی تہوّر علی رام پور کے پٹھان تو تھے مگر "نہ بھئی ہم سے تو یہ نہ ہوگا" کہہ کر رہ گئے۔ البتہ موچی دروازے کے منشی فرزند علی نے ہماری ترجمانی کی ذمہ داری اٹھائی اور سالک صاحب کے تشریف لانے سے پہلے ہی ہم نے چاٹ اور قلفی والے کو پیشگی رقم ادا کر دی۔ سالک صاحب حسب معمول تشریف لائے۔ چاٹ اور قلفی کا آرڈر دیا اور جب رقم نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو منشی فرزند علی نے (جن کے گنج پر پسینے کے قطرے بجلی کی روشنی میں چمکنے لگے تھے) اپنی تلخ ڈیوٹی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ادا کر دی اور سالک صاحب جیسے ایک دم سناٹے میں آ گئے۔ ہم تینوں کو باری باری گھورا اور بولے "تم لوگوں نے پچھلے تین مہینوں کی چاٹ کا نمک اور قلفی کی مٹھاس غائب کر دی ہے۔ ارے سرمایہ دارو! میں تم سے زیادہ کماتا ہوں اس

لیے مجھے ہی خرچ کر لینے دیا کرو۔ تم اپنی تنخواہیں چاٹ پر اڑا دو گے تو تمہاری بیویاں اور بچے کیا تمہیں چاٹیں گے؟ بڑی بیہودگی کی تم نے----'' اور چند مہینے بعد تک سالک صاحب بلاناغہ ہمیں چاٹ کھلاتے رہے حتیٰ کہ مجھے بیمار ہو کر گاؤں بھاگ جانا پڑا۔

آخر وہ کیا بات تھی کہ ایک بلند پایہ ادیب اور اولوالعزم صحافی' جس کے پاس چند لمحے بیٹھنے کے لیے امرا، وزرا، تک ترستے رہتے تھے' پچھتر روپے ماہانہ پانے والے ایک غریب اور نومشق شاعر اور دو کاتبوں کے پاس روزانہ دو گھنٹے گزار جاتا تھا۔ میں نے یہیں لاہور میں وہ شعرا اور ایڈیٹر بھی دیکھے تھے جو نومشق شاعروں اور کاتبوں کی سی اقتصادی حیثیت والے لوگوں سے کترا کر نکل جاتے تھے تاکہ ان کا کوئی شناسا انہیں غربا سے مصافحہ کرتے دیکھ کر ان کی بلند سماجی حیثیت پر شبہ نہ کرنے لگے۔ اور یہاں ''انقلاب'' کا مدیر اور ملک کا مسلم الثبوت شاعر اور ادیب کہہ رہا تھا ''دیکھو بھئی! کل اتوار ہے۔ کل تم تینوں میرے ہاں کھانا کھاؤ گے۔ مہر پر تحقیق و تفحص کا موڈ سوار نہ ہوا تو اسے بھی بلا لیں گے اور خوب باتیں ہوں گی اور شعر اور لطیفے ہوں گے اور غالب کا فارسی دیوان پڑھا جائے گا۔ غالب کی فارسی غزلوں کی عظمت کو اب تک بہت کم لوگوں نے پہچانا ہے----وہ----''

اور پھر میرزا بیدل کی شاعری' غالب پر بیدل کے اثرات' غالب کی اُردو شاعری میں فکر کی گہرائی کے دور دور تک پھیلے ہوئے رشتے' غالب سے جدید اُردو شاعری کی اثر پذیری' اور یوں بیدل اور غالب کی فارسی شاعری سے بیسویں صدی کی معیاری اُردو شاعری کا بالواسطہ رشتہ----''اور ستم یہ ہے کہ ہمارے شاعر غالب کی فارسی شاعری کو پڑھتے ہی نہیں----'' غرض یہ سب گرہیں کھلنے لگتیں۔ مگر یہاں مجھے سالک صاحب کے بے پناہ تجرِ علمی کی نمائش مقصود نہیں۔

کہنا صرف یہ ہے کہ ایک بہت بڑی شخصیت جب اپنی عظمت کے باوجود ذرا سا نشیب میں آ کر ''بچوں'' کو بھی اپنی عظمت میں شریک کر لیتی ہے تو زندگی پر کتنا پیار آتا ہے۔ سالک صاحب مجسّم عظمت تھے اور مجسّم پیار اور اس کے ہزاروں شناساؤں میں سے اگر کسی کو اس سے شکایت تھی تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس نے سالک کو سمجھا ہی نہیں تھا اور پھر بعض لوگوں کا ''ذائقہ'' ہی خراب ہوتا ہے اور ان کا ذہن شہد میں بھی کونین کا مزا ڈھونڈ نکالتا ہے۔

لاہور کے ناشرین کا ایک وفد سالک صاحب کے پاس گیا کہ ان کی ایک تحریک میں وہ ان کی اخلاقی امداد کریں۔ سالک صاحب کو اس تحریک سے اختلاف تھا اس لیے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف کہہ دیا کہ ''میرے خیال میں آپ لوگ غلطی پر ہیں اس لیے آپ کی حمایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ آپ کی مخالفت ضرور کروں گا اور یہ مخالفت اصولی ہوگی۔'' جب سے میں نے بعض ناشرین کو سالک صاحب سے ایسی باتیں منسوب کرتے سنا ہے جو سالک صاحب کا جانی دشمن بھی ان سے منسوب نہیں کر سکتا (بشرطیکہ وہ سالک صاحب کو جانتا ہو) میں نے ان دوستوں میں سے ایک دو کو کہا کہ تمہیں سارے لاہور میں صرف سالک ہی اپنا مخالف نظر آیا۔ اس لیے کہ اس نے ریاکاری کے بجائے صداقت سے کام لیا اور اس کی اخلاقی جرأت نے (اور اخلاقی جرأت کی امید صرف بلند اخلاق انسان ہی سے کی جا سکتی ہے) تمہیں دھوکے میں نہیں رکھا ورنہ یہیں لاہور میں تمہیں ایسے ''ہمدرد'' بھی ملے تھے جنہوں نے تمہارے ہاتھوں میں چپو تھمانے کے بعد تمہاری کشتی میں چپکے سے چھید کر ڈالے۔ اور پھر خود تمہارے اندر بھی ایسی شخصیتیں موجود تھیں جنہوں نے تمہارے پاس جماعتی مفاد کا رونا رویا اور تنہائی میں جا کر اُپنے ذاتی مفاد کی قربان گاہ پر اپنے ضمیر کی بھینٹ دے دی۔ سو یہ سب ''ذائقے'' کی باتیں ہیں! (یہاں یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ میں اپنی

ذاتی حیثیت میں ان ناشرین کے مطالبات کا ہمنوا تھا اور آج تک ہوں)۔
سو یہ تھے عبدالمجید سالک جو پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں وسیع القلبی اور متوازن اجتہاد کا ایک نشان تھے اور جن کی شخصیت کے قریبی مطالعے کے بعد غالب کا یہ شعر زبان پر رواں ہو جاتا تھا:

راہ زیں دیدہ وراں پرس کہ در گرم روی
جادہ چوں نبض تپاں در تنِ صحرا بینند

باقی رہے وہ سالک جو گھر میں دھوتی باندھے پھرتے رہتے تھے۔ جنہوں نے کرسی اور میز کے بجائے ہمیشہ پلنگ پر گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بلکہ لیٹ کر لکھا۔ جن کے تیس تیس صفحات کے ''فی البدیہہ'' لکھے ہوئے علمی مقالات میں بھی آپ کو کوئی ایک لفظ کٹا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ جن کی شیروانی کی ایک جیب میں رومال اور دوسری میں ''شو مال'' ہوتا تھا' جن کے سینے کی بائیں جیب میں گھڑی اور دائیں میں کاغذ کا وہ طویل ٹکڑا ہوتا تھا جس پر ضرورت مندوں کے ناموں اور کاموں کی فہرست درج ہوتی تھی۔ جو مطالعہ کرتے وقت عینک کو آنکھوں پر سے اٹھا کر ماتھے پر رکھ لیتے تھے۔ جو اچھا پہننے اچھے کھانے اور اچھا رہن سہن کے سلسلے میں بلا کے وضعدار تھے اور جو اپنے تمام بیٹوں بیٹیوں کی شادیوں کے بعد اطمینان سے ایک گوشے میں بیٹھے ماضی اور حال کے بعد مستقبل پر بھی مسکرا رہے ہوتے تھے۔ میں ان کا عقیدت مند تھا لیکن میری عقیدت اندھی نہیں، تھی نہایت باشعور تھی۔ میں نے تو خدا کو بھی حسب مقدور سمجھ لینے کے بعد مانا۔

***

مولانا غلام رسول مہر

مولانا غلام رسول مہر کی رحلت کی صورت میں وہ خطۂ ارض، جسے جنوبی ایشیا کہتے ہیں، دانشوری کی اس عظیم روایت کی روشن مشعل سے محروم ہوگیا ہے جس کا آغاز آج سے تیرہ صدی پہلے، اموی اور پھر عباسی عہدِ حکومت میں ہوا تھا۔ آج کے دور کا کوئی بھی دانشور اتنے ہمہ گیر علمی تبحر کو سنبھال ہی نہیں سکتا چنانچہ ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو صرف پاکستان ہی اپنے ایک عظیم اور قدآور فرزند سے محروم نہیں ہوا بلکہ اس پورے خطۂ ارض پر علم و تہذیب کی قدیم روایات سر پیٹ کر رہ گئی ہیں۔ مولانا مہر کی سی شخصیت جو علوم کے متعدد شعبوں پر اتنے پر اعتماد تبحر کے ساتھ حاوی ہو، اب کہیں ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتی۔ اب تو علمی تبحر کے بڑے بڑے دعویداروں کے عقب میں ذاتی چپقلش اور فروعی عداوتیں ننگا ناچ ناچتی ہوئی صاف دکھائی دیتی ہیں اور وقار و متانت کے بڑے چمک دار خولوں کے پیچھے منافقت کے نہایت گھناؤنے چہرے ہر راہ چلتے پر دانت کچکچاتے نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی کا لاہور جن عظیم شخصیتوں کے وجود سے منور تھا ان میں سے آخری شخصیت بھی اٹھ گئی۔ لاہور کسی بھی دور میں ایسی شخصیتوں سے محروم نہیں رہا۔ مگر مولانا کی رخصت کے بعد فی الوقت اس افق پر کوئی ستارہ نظر نہیں آتا۔ یوں سمجھئے

لاہور جیسے لٹ سا گیا ہے، محض اس وجہ سے کہ لاہور کے ایک گوشے میں وہ حجرہ اب خالی پڑا ہے جو اہلِ علم و ادب کا مرجع تھا اور جہاں علم و دانش کے پیاسے جس توقع سے جاتے تھے اس سے کہیں زیادہ شادکام ہو کر پلٹتے تھے۔

مولانا غلام رسول مہر کی ہمہ جہت شخصیت کا تنوع حیرت انگیز تھا۔ وہ جتنے بڑے اخبار نویس تھے اتنے ہی بڑے ادیب، اتنے ہی بڑے محقق، اتنے ہی بڑے مورخ اور اتنے ہی بڑے نقاد بھی تھے۔ ان سب حیثیتوں پر مستزاد ان کی شخصیت کا وہ جمال تھا جو ان کے ہر ملنے والے پر اپنا پرتو ڈال کر اسے مسحور کر لیتا تھا۔ کہتے ہیں کہ مشرق کے بعض بڑے بڑے شعرا کے نظریاتِ حیات پر ان کے تخلص نہایت شدت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں غالب اور اقبال اس کی مثالیں ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر مولانا غلام رسول کے لیے مہر سے زیادہ کوئی تخلص مناسب نہ تھا کیونکہ ساری عمر وہ مہر و محبت کے پیکر بنے رہے۔ دشمن بھی ان کے در سے مایوس نہیں لوٹتا تھا۔ ۷۶ برس کی عمر میں بھی ان کے مزاج کا نمایاں ترین عنصر شفقت تھا۔ پھر علمی لحاظ سے اتنے کارنامے انجام دینے کے باوجود ان کے ہاں اتنی عاجزی تھی جو صرف ان بڑے لوگوں کے ہاں ملتی ہے جن پر ان کا بڑا پن مسلط ہو کر نہیں رہ جاتا۔ بلکہ وہ اپنی عظمت کو اپنی شخصیت میں کھپا چکے ہوتے ہیں۔ اپنی عظمت کا یقین صرف کم ظرفوں کو ہوتا ہے۔ صحیح معنوں میں عظیم تو مولانا مہر کی طرح وہ ہوتے ہیں جو عظیم کارناموں کے باوجود اپنی مساعی کو ہمیشہ طالب علمانہ قرار دیتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ علم میں اضافے کے ساتھ علم کے افق وسیع تر ہو جاتے ہیں۔ اپنی عظمت پر بضد رہنے والے صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے ذہنی افق ہمیشہ سمٹے سکڑے رہتے ہیں چنانچہ اس ننھے منے افق پر انہیں اپنی شخصیت چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

مولانا مہر کے علمی کارناموں کا جائزہ تو اہلِ علم ہی لے سکتے ہیں۔ مجھے تو

صرف چند ذاتی تاثرات عرض کرنا ہیں۔ لاہور سے ایک روزنامے نے مولانا کے بارے میں درست لکھا ہے کہ:

''آخری ایام میں وہ ایک حجرہ نشین درویش تھے اور انہوں نے اپنے حجرے کی تمام کھڑکیاں کھلی رکھی تھیں۔''

ان کی ادارت ''انقلاب'' کا ذکر ہے اور یہ شاید ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے۔ میں ''پھول'' اور ''تہذیبِ نسواں'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے لاہور آ گیا تھا اور اپنے محسنِ گرامی مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کے توسط سے مولانا مہر سے تعارف حاصل ہوگیا تھا۔ میں قریب قریب روزانہ دفتر ''انقلاب'' میں حاضری دیتا تھا۔ ایک روز میں سالک صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ مولانا صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ ''اللہ مجھے معاف کرے آج بی۔اے کے اُردو پرچے دیکھتے ہوئے میں نے ایک امیدوار کو، جس کے جوابات کچھ ایسے معیاری نہیں تھے، محض اس لیے زیادہ سے زیادہ نمبر دے ڈالے کہ اس نے تمہارا (یعنی میرا) ایک اچھا شعر کسی سوال کے جواب کے دوران مناسب مقام پر درج کیا تھا۔ وہ شعر یہ تھا:

تیری نظروں میں تو دیہات ہیں فردوس مگر
میں نے فردوس میں اجڑے ہوئے گھر دیکھے ہیں

میں نے عرض کیا کہ یہ شعر تو میرے افسانوں کے ایک مجموعے ''بگولے'' کے منظوم دیباچے کا ہے۔ حیران ہو کر پوچھا کہ کیا تم افسانے بھی لکھتے ہو؟ سالک صاحب نے میرے دیہاتی پس منظر کے افسانوں کی تعریف کی تو مولانا نے فرمایا کہ اس نوجوان کو اپنی تمام تر توجہ شاعری پر صرف کرنی چاہیے۔ پھر مجھ نوآموز کی شاعری کی بہت تعریف فرمائی۔ ظاہر ہے کہ میری بے حد ہمت افزائی ہوئی مگر دوسرے روز میں ان کی خدمت میں اپنے افسانوں کا متذکرہ مجموعہ پیش کر آیا۔ چند روز کے بعد ملاقات ہوئی تو پوچھا ''یہ کرشن چندر کون ہے؟'' کرشن نے میرے اس

مجموعے کا دیباچہ لکھا تھا۔ میں نے نوجوان کرشن کے افسانوں کی تعریف کی اور حیران ہوتا رہا کہ مولانا جدید ادب کا مطالعہ کیوں نہیں کرتے جبکہ سالک صاحب جدید سے جدید تر ادب کا بالاستیعاب مطالعہ فرماتے ہیں اور اس کے بارے میں ایک واضح رائے رکھتے ہیں۔ اس کے بعد بھی مولانا سے جب کبھی ملاقات ہوئی انہوں نے میری شاعری کو بے حساب سراہا۔ اور ان کی اس بے پناہ شفقت نے میرے حوصلے بڑھائے مگر میرے دل میں ہمیشہ کچھ کھد بد رہی کہ مولانا جدید ادب کی تازگی سے کیوں متعارف نہیں ہوتے۔

''انقلاب'' بند ہوا اور مولانا ایک طرح سے گوشہ نشین ہو گئے تو ایک روز میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمانے لگے:

''بھئی یہ تمہارا سعادت حسن منٹو کس بلا کا افسانہ نگار ہے! میں نے مغرب کے مختصر افسانے بھی گاہے گاہے پڑھے ہیں مگر مجھے اس معیار کا سچا اور کھرا افسانہ نگار کم ہی نظر آیا ہے۔''

میں بے حد خوش ہوا کہ مولانا تاریخ کے مطالعے کے دوران ہم لوگوں کے افسانوں کو بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا نے جدید ادب کا مطالعہ باقاعدگی سے شروع کر دیا ہے۔

پھر محترم فیض صاحب نے کراچی میں جشنِ غالب منعقد کیا تو میں ان کے مشاعرے میں اور مولانا اس کے مقالات کے اجلاس میں شرکت کے لیے کراچی گئے۔ آرٹس کونسل میں صادقین کی ان تصویروں کی نمائش بھی ہو رہی تھی جو انہوں نے غالب کے اشعار سے متاثر ہو کر بنائی تھیں۔ طے پایا کہ یہ نمائش دیکھی جائے۔ مولانا مہرؔ، پروفیسر حمید احمد خاں، پیر حسام الدین راشدی، مولانا عبدالقادر، ہاجرہ مسرور اور احمد علی خاں کے اس گروہ میں، میں بھی شامل تھا مگر ڈر رہا تھا کہ مولانا جو غالب کے سخت شیدائی ہیں، صادقین کے منفرد اندازِ مصوری کی

تحسین نہیں کر سکیں گے اور غالب کے کلام کو استخوانی انگلیوں اور ہاتھ ہاتھ بھر کی گردنوں میں محبوس دیکھ کر پریشان ہوں گے۔ مگر جب ہم نمائش میں داخل ہوئے تو میں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ مولانا مہر تو ایک ایک تصویر کے سامنے آدھ آدھ گھنٹہ رک کر اس کے حسن و بلاغت کے قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ بہت دیر کے بعد جب ہم اس نمائش سے نکلے تو مولانا اتنے متاثر تھے کہ فرمایا۔ ''آج ایک اور غالب سے ملاقات ہوئی۔ اس شاعر کی شخصیت کتنی پہلودار تھی اور صادقین نے غالب کی شخصیت کے اس پہلو کو' جو ہم سب کی نظروں سے پوشیدہ تھا' کتنی خوبصورتی سے فن کی گرفت میں لیا ہے!''

یوں ثابت ہو جاتا ہے کہ مولانا نے گوشہ نشینی کے بعد اپنے حجرے کی تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ یہ وسیع القلبی بہت کم بزرگ دانشوروں کے حصے میں آئی ہے۔

ہمارے پڑھے لکھے طبقے میں شعر شناسی کا فقدان ہے۔ حد یہ ہے کہ بعض معروف شعرا کو بھی اچھے شعر کا کم ہی پتا چلتا ہے۔ میں نے جن اِکا دُکا اصحاب کو شعر شناس پایا ہے' ان میں مولانا مہر کا درجہ بہت اونچا تھا۔ غالب کے تو خیر وہ عاشق تھے اور اس کے ایک ایک شعر کی ایسی ایسی پرتیں کھولتے چلے جاتے تھے کہ ان کے اندازِ تحسین پر حیرت ہوتی تھی۔ نظیری اور عرفی کے بہت قائل تھے۔ ایک بار عرفی کا ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ میں نے اس کے قصائد تو پڑھے ہیں مگر اس کی غزلوں کا دیوان' ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔ فرمانے لگے ''میرے پاس ہے''۔ پھر دیوان مجھے تھما دیا۔ میں سمجھا مجھے پڑھنے کے لیے عنایت کر دیا ہے چنانچہ جب میں اٹھا تو یہ دیوان بھی ساتھ لیے آیا۔ تیسرے روز مجھے مولانا کا خط ملا کہ میاں! میں تو سمجھا تھا تم عرفی کو ایک دن کے لیے لے جا رہے ہو مگر دو روز ہو گئے' تم نے دیوان واپس نہیں کیا۔ میں اگر صبح کو عرفی کی ایک آدھ

غزل پڑھ نہ لوں تو سارا دن بے چینی میں گزرتا ہے اس لیے اگر تمہیں میرا سکون و آسودگی عزیز ہے تو میرا خط ملتے ہی دیوانِ عرفی مجھے پہنچا دو۔ میں نے تعمیل کی مگر آج تک حیران ہوں کہ ہم اہلِ قلم میں سے کیا کسی میں بھی فن کے ساتھ اس انتہا کی لگن ہے! میں گذشتہ دو برس کے دوران جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا' ان سے اپنے سوانح یا اپنی یادیں مرتب کرنے کی درخواست کرتا رہا۔ خود وہ انہی خطوط پر سوچ رہے تھے مگر انہوں نے اتنے بہت سے کام شروع کر رکھے تھے' اور ایک ایک لفظ کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے انہیں اتنی محنت کرنی پڑتی تھی اور وہ تحقیق و استناد کے لیے ایسے ایسے مرحلوں میں سے گزر رہے ہوتے تھے کہ میں سمجھتا تھا وہ یہ کام نہیں کر پائیں گے مگر اس دیوقامت علمی شخصیت کا طریقِ عمل عجیب و غریب تھا کہ وہ بیک وقت متعدد منصوبوں پر پورے کمال کے ساتھ عمل پیرا تے تھے۔

سوانح اور یادداشتوں کے سلسلے میں ہمیشہ فرماتے تھے کہ میں اپنے اس فرض سے غافل نہیں ہوں۔ دراصل انہیں معلوم تھا کہ اگر انہوں نے سوانح لکھے تو یہ برصغیر پاکستان و ہند کے علاوہ ممالک اسلامیہ اور بلادِ عربیہ کی نصف صدی کی نہایت مستند سیاسی' تہذیبی اور معاشرتی تاریخ ہوگی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ مولانا کی یادداشتوں کا مسودہ قریب قریب تیار ہے۔ ساتھ ہی ان کی عمر بھر کی خواہش تھی کہ وہ سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس نقطۂ نظر سے لکھیں کہ حضور سراپا رحمت تھے اور آپ کے پیش نظر انسانیت کی بہبود تھی۔ معلوم ہوا سیرت کی یہ کتاب طباعت کے مراحل میں سے گزر رہی ہے۔

مولانا غلام رسول مہر کی شخصیت کا احاطہ کرنا میرے لیے نہایت دشوار ہے۔ ان کے چلے جانے سے میرے دل میں جو گھاؤ پیدا ہوا' اس پر چند پھاہے رکھنے کے لیے میں نے مولانا کی یہ چند باتیں یاد کی ہیں۔ مسلم ٹاؤن کی ایک

پرانی وضع کی کوٹھی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں، رنگ رنگ کی کتابوں کے میناروں میں گھرے ہوئے مولانا مسلسل ادب وفن کی غواصی میں مصروف ہوتے تھے اور جب میں (یا کوئی بھی اور) حاضر ہوکر سلام کرتا تھا تو وہ اتنی بے حدود محبت اور توجہ سے پیش آتے تھے جیسے وہ میرے ہی انتظار میں بیٹھے تھے۔ لاہور مولانا مہر کی سی ہمہ جہت شخصیتوں سے محروم ہوکر کتنا غریب ہوگیا ہے۔

مولانا چراغ حسن حسرت

مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کے بارے میں چند یادیں سترہ اٹھارہ برس پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اگر چہ ان یادوں کو بظاہر کوئی ادبی مقام یا علمی اہمیت حاصل نہیں ہوسکتی مگر ذاتی طور پر مجھے ان پر فخر ہے۔اس لیے کہ یہ یادیں اُردو ادب اور صحافت کی ایک ایسی شخصیت کے متعلق ہیں جس کی عظمت اور ہمہ گیری ہماری تہذیبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں حضرت مولانا سالک مرحوم کی خدمت میں نہایت باقاعدگی سے حاضر ہوتا تھا۔ میری قومی اور ملّی نظمیں روزنامہ ''انقلاب'' میں شائع ہوتی تھیں اور اسی لیے سالک مرحوم حضرت حفیظ ہوشیارپوری کو اور مجھے ''شاعرِ انقلاب'' کہتے تھے۔ اُن دنوں ''انقلاب'' کا دفتر ریلوے روڈ پر خالصہ سٹریٹ میں تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار ایسا اتفاق ضرور ہوتا تھا کہ میری موجودگی میں مولانا حسرت بھی مولانا سالک کے ہاں آ نکلتے اور میں ان کی باتیں سن کر حیران ہوتا رہتا کہ یہ کیسے لوگ ہیں کہ جب اپنے کالموں میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے انہیں ایک دوسرے کو دیکھنا بھی گوارا نہ ہوگا۔ مگر یہاں پکے دوستوں بلکہ سگے بھائیوں کی طرح نجی معاملات

میں ایک دوسرے سے مشورے لے رہے ہیں۔ آج کے علمی ادبی اختلافات کو جب میں سالک و حسرت کی ان ملاقاتوں کی روشنی میں دیکھتا ہوں تو یہ سوچ کر کتنا دکھ ہوتا ہے کہ ہم لوگ آپس میں بچوں کی طرح لڑتے اور انہی کی طرح ایک دوسرے سے کٹیاں کر لیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ سالک صاحب نے میرا تعارف حسرت صاحب سے یوں کرایا تھا کہ یہ مولانا غلام مرشد صاحب کے خالہ زاد بھائی ہیں اور ''انقلاب'' میں ان کی نظمیں باقاعدگی سے چھپتی رہتی ہیں اور حسرت صاحب نے فرمایا تھا۔ ''آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے لیکن انہوں نے اپنی داڑھی کہاں چھپا رکھی ہے۔''

ان ملاقاتوں میں میری حیثیت زیادہ تر ایک خاموش سامع کی تھی۔ اول تو میرے پاس ادب و صحافت کے ان دیووں کے سامنے بولنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ پھر دونوں حضرات خاص طور سے حسرت صاحب کچھ ایسے نستعلیق لہجے میں اُردو بولتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا سیدھے لکھنؤ سے آ رہے ہیں۔ ایک روز سالک صاحب نے دفتر سے اٹھتے ہوئے فرمایا کہ چلو آج تمہیں ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر اقبال) کے پاس لے جائیں۔ میں علامہ اقبال سے ملنے کے لیے تڑپ رہا تھا مگر شاعری میں نوآموز تھا اور پھر ابھی تک میں وہ فقرہ ہی مکمل نہیں کر سکا تھا جو مجھے ان سے تعارف کے بعد ادا کرنا تھا۔ سالک صاحب کی شخصیت کا سہارا لے کر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہونا میرے لیے بہت آسان تھا اس لیے ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ دل محمد روڈ پر ایک گلی میں ''شیرازہ'' کے دفتر میں تشریف لے گئے اور حسرت صاحب کو ساتھ لے کر جب سڑک پر آئے تو ادھر سے اختر شیرانی مرحوم ایک ٹانگے میں سوار جا رہے تھے۔ انہوں نے فوراً ٹانگا رکوایا۔ دونوں بزرگوں کو نہایت سعادت مندی سے سلام کیا اور ہماری منزلِ مقصود کا پوچھ کر کوچوان سے کہا کہ میو روڈ پر لے چلو۔ وہاں جاوید منزل کے سامنے ٹانگہ رکوایا'

اتر کر ہمیں رخصت کیا اور چلے گئے۔ علامہ صاحب جاوید منزل کے سامنے والے لان میں پلنگ پر نیم دراز حقہ پی رہے تھے۔ سالک و حسرت کو دیکھ کر ان کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی۔ دیر تک سالک صاحب سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور حقہ پیتے رہے۔ پھر حسرت صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا ''حسرت صاحب آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' اور حسرت صاحب نے جواب دیا ''جی میں آپ کے حقے کی خودی پر غور کر رہا ہوں۔'' علامہ اقبال نے بے اختیار ہنستے ہوئے اپنے حقے کی نے پہلی بار حسرت صاحب کی طرف موڑی۔ اس کے بعد بھی دیر تک باتیں ہوتی رہیں مگر اپنے حقے کی خودی انہیں دیر تک گدگداتی رہی۔

حسرت صاحب کو ایک روز معلوم ہوا کہ جب سالک صاحب سری نگر چلے جاتے ہیں تو ''افکار و حوادث'' کا کالم ان کے احباب لکھتے ہیں اور ان کے احباب کی فہرست میں میرا نام بھی شامل ہے اور ''انقلاب میں اب تک میرے پندرہ بیس کلام شائع ہو چکے ہیں۔ فوراً مجھے ''شیرازہ'' میں لکھنے کی دعوت دی اور میں نے صرف ''قاسمی'' کے نام سے اس بے مثال فکاہی ہفت روزے میں متعدد مضامین لکھے۔ ان میں سے اگر اب کوئی مضمون میری نظر سے گزرتا ہے تو مجھے ندامت ہوتی ہے کہ میں مزاح کے نام پر کیا کیا جھک مارتا رہا اور حیرت ہوتی ہے کہ حسرت مرحوم میرے ہر مضمون کی کتنی تعریف کرتے تھے۔ دراصل وہ زبان و بیان کے نہایت اعلیٰ معیاروں کے پابند ہونے کے باوجود نئے لکھنے والوں کی نہایت فراخ دلی سے حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے بزرگانِ ادب اور مدیرانِ جرائد ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نوواردوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اسی لیے تو نووارادنِ بساطِ ادب کے سلسلے میں مولانا حسرت کے علاوہ مولانا سالک، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا حامد علی خاں اور مولانا

صلاح الدین احمد کا طرزِ عمل قطعی طور پر یکساں تھا۔

جنگ شروع ہونے کے بعد مولانا حسرت فوج میں چلے گئے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں شاید خبروں کے شعبوں سے متعلق ہوگئے۔ انہی دنوں دہلی ریڈیو نے جدید شعرا کے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں حفیظ جالندھری، ڈاکٹر تصدق حسین خالد، ڈاکٹر تاثیر، سیماب اکبر آبادی، روشن صدیقی، فیض احمد فیض، ن۔م۔راشد، میراجی اور اسرارالحق مجاز کے علاوہ میں بھی شامل تھا۔ اُن دنوں دلی ریڈیو سے مولانا حسرت کے علاوہ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ن۔م۔راشد، میراجی، ممتاز مفتی، اوپندر ناتھ اشک اور حفیظ ہوشیار پوری وغیرہ بھی متعلق تھے۔ میں منٹو کا مہمان تھا اور منٹو نے اپنے سب ساتھیوں کی کوئی نہ کوئی چھیڑ بنا رکھی تھی۔ متذکرہ مشاعرے کے موقع پر انہی احباب میں سے کسی نے جل کر کہا کہ ''منٹو! تم ہمیں چھیڑنے میں بڑے تیز ہو۔ حسرت صاحب بھی یہیں ہیں، کبھی انہیں بھی چھیڑ کر دیکھو تو تمہیں مزہ آ جائے۔'' منٹو نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور حسرت صاحب کو چھیڑنے چلا۔ ہم میں سے بیشتر احباب اس کے ساتھ تھے۔ مولانا نے چائے سگرٹ سے تواضع کی اور رات کے مشاعرے کا ذکر چلا۔ مولانا حسرت جدید شاعری کو صرف فیض کی شاعری کی حد تک برداشت کرنے کو تیار تھے اس لیے کہنے لگے: ''ن۔م۔راشد سے کہہ دو ایک وقت آئے گا جب غزل کہنے کو اس کا جی چاہے گا مگر کہہ نہیں سکے گا۔ آگے آگے قافیے بھاگے جا رہے ہوں گے اور ان کے پیچھے راشد دوڑا جا رہا ہوگا۔'' منٹو نے کہا ''مگر حسرت صاحب! ایسی روایت پسندی بھی کیا جو قدامت پسندی بن کر رہ جائے۔ آخر نئے شاعروں کو علامہ اقبال سے آگے ہی تو جانا ہے۔'' منٹو کا یہ کہنا تھا کہ مولانا حسرت کے تیور بدلے اور انہوں نے علامہ اقبال کی شاعری کے حق میں ایسی زوردار تقریر کی کہ ہم لوگ تو دہل کر رہ گئے۔ مگر منٹو کہاں ماننے والا تھا۔ وہ بیچ بیچ میں کہتا گیا

کہ ''حسرت صاحب! وہ تو میں بھی آپ سے متفق ہوں۔ مگر میں فلسفوں اور پیغاموں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ شاعری کی بات کر رہا ہوں۔ یاد ہو تو علامہ کا کوئی ایک چوندا چوندا شعر سنایئے۔'' مولانا طیش میں آ کر کہتے ''چوندا چوندا؟ نہیں مولانا! علامہ اقبال شاعری کرتے تھے پراٹھے نہیں پکاتے تھے۔'' منٹو پھر کوئی شرارت کرتا اور مولانا حسرت پھر تاؤ میں آ جاتے۔ علامہ اقبال کے فکر وفن کے خلاف وہ کسی کا ایک جملہ بھی سننے کو تیار نہ تھے۔ پھر جب منٹو نے دیکھا کہ مولانا کا رنگ سرخ ہو رہا ہے اور ان کی آواز کمرے سے باہر بھی گونج رہی ہے تو اس نے کہا۔ ''میں تو آپ کو صرف چھیڑنے آیا تھا اور مجھے داد دیجیے کہ میں آپ کو چھیڑنے میں کامیاب رہا ہوں۔'' اس پر مولانا مسکرائے اور ہم سے کہنے لگے ''سعادت کو یہ حق حاصل ہے مگر ادیب کی حیثیت سے نہیں، کشمیری کی حیثیت سے۔''

اس سے پہلے بھی دلی ہی میں، منٹو نے ایک یادگار محفل برپا کی تھی۔ فیض احمد فیض صاحب ایم۔اے۔او کالج امرتسر کے طلبا کے ہمراہ علی گڑھ یونیورسٹی دیکھنے جا رہے تھے۔ دلی میں ایک روز قیام کیا اور منٹو نے انہیں شام کی دعوت پر مدعو کر لیا۔ اس دعوت میں وہ تمام ادیب اور شاعر حضرات شامل تھے جن کا پہلے ذکر آ چکا ہے۔ اس دعوت میں مولانا حسرت نے مجھے مولانا غلام مرشد صاحب کا بھائی ہونے کی حیثیت سے سوڈے کی بوتلیں کھولنے پر مامور کر رکھا تھا۔ میں یہ فرض بڑی سعادت مندی سے انجام دیتا رہا کیونکہ میں صرف یہی فرض انجام دینے کا اہل تھا۔ محفل موڈ میں آئی تو حسرت صاحب نے کہا کہ جو لوگ غزل کہتے ہیں وہ اپنی اپنی غزلیں سنائیں۔ ایک دور ختم ہوا تو حسرت صاحب نے کہا کہ جی نہیں بھرا۔ ایک ایک غزل اور ہو جائے۔ اب کے منٹو نے میز پر مکا مار کر اعلان کر دیا کہ اب ہوگی تو نظم ہوگی ورنہ کچھ نہیں ہوگا۔ حسرت صاحب نے کہا

''جو حضرات غزل نہیں سننا چاہتے وہ کانوں میں اپنی انگلیاں دے لیں یا باہر تشریف لے جائیں۔'' اس جھگڑے نے اتنا طول کھینچا کہ پورا ہوٹل حسرت صاحب اور منٹو صاحب کے مکالموں سے گونجنے لگا۔ منٹو نے انتہائی غصے میں کہا ''مولانا آپ اپنے کو کیا سمجھتے ہیں۔ خدا کی قسم اگر کوئی ایسا کیمیاوی عمل میرے ہاتھ لگ جائے جس کی مدد سے میں ''فسانۂ آزاد'' کے تمام روزمرے اور محاورے آپ کے دماغ سے نچوڑ لوں تو پتہ ہے کیا ہو؟ آپ ایک سیدھے سادے ''ھاتو'' بن کر رہ جائیں۔'' جواب میں مولانا گرجے ''برخوردار! اگر یہی کیمیاوی عمل میرے ہاتھ لگ جائے جس کی مدد سے میں تمہارے اندر سے سومرسٹ ماہم کی سب کہانیوں کے چربے نکال لوں تو پتہ ہے کیا ہو؟ تم سیدھے علی گڑھ جا کر سیکنڈ ایئر میں داخلہ لے لو۔'' ان مکالموں سے پوری محفل کشتِ زعفران بن گئی اور انہی قہقہوں کے دوران میرے کہنے پر منٹو اٹھا اور مولانا حسرت کے سینے سے چمٹ گیا اور مولانا مسکراتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے ''ہاں بھئی اب دو ایک غزلیں ہو جائیں۔''

قیام پاکستان کے بعد جب ''امروز'' جاری ہوا اور ساتھ ہی ترقی پسند مصنفین کے ایک رہنما ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے ترقی پسند مصنفین کے لتے لینے شروع کیے تو ایک روز میں کسی کام سے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتفاق سے اسی وقت ڈاکٹر تاثیر بھی آ نکلے۔ مولانا نے فوراً کہا کہ بھئی یہ بہت اچھا ہوا ہے کہ آپ دونوں یہاں اکٹھا ہو گئے۔ آپ کی بحثوں نے تمام ادبی حلقوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ یہاں بیٹھ کر طے کر لیجیے کہ کون غلطی پر ہے۔ میری تو جان پر بن گئی کہ ڈاکٹر تاثیر بہرصورت میرے محترم تھے اور میں ان سے زبان لڑانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر وہ گفتگو کے بادشاہ تھے اور میں بولنے سے پہلے بیشتر وقت تولنے میں گزار دینے والا' مگر ڈاکٹر تاثیر کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور وہ

اپنے جچے تلے اور عالمانہ انداز میں اپنے دلائل دینے لگے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ آخر آپ بھی تو ایک ترقی پسند شاعر اور ادیب کہلا چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''ترقی پسند ادب کی مثال ایک چھاتے کی سی تھی جسے میں نے امپیریلزم کے آفتاب کی تمازت سے بچنے کے لیے لگا رکھا تھا۔ اب یہ آفتاب غروب ہو چکا ہے اس لیے میں نے بھی یہ چھاتا لپیٹ کر الگ رکھ دیا ہے۔'' میں نے عرض کیا ''مگر ڈاکٹر صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ آفتاب پوری طرح غروب ہو چکا ہے؟'' بولے ''جی ہاں'' میں نے کہا ''تو اس صورت میں میں آپ سے بحث کیسے کر سکتا ہوں۔'' کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر تاثیر جانے لگے تو مولانا حسرت نے کہا ''چھاتا نہ لگائیے' مولانا ہیٹ ہی پہن لیا کیجیے!'' ڈاکٹر تاثیر بے حد ذہین آدمی تھے۔ مولانا کے مشورے کی نوک کی چبھن کو فوراً محسوس کر لیا اور مولانا کی قراقلی ٹوپی پر کوئی مزے کی پھبتی کس کر چلے گئے۔

میں ''نقوش'' کا ایڈیٹر تھا۔ میں نے کہیں سے سنا کہ مولانا حسرت نے ایک نئی غزل کہی ہے اور پشاور ریڈیو کے مشاعرے میں یہی غزل پڑھ بھی آئے ہیں۔ میں اپنے رسالے کے لیے یہ غزل لینے حاضر ہوا تو فرمایا ''آپ نے ٹھیک سنا ہے میں نے غزل کہی تو ہے مگر مولانا اب غزل کہنے میں مزا نہیں رہا۔ اب تو ایسے ایسے لوگ غزلیں کہنے لگے ہیں کہ اگر غزل کہنے کی بجائے آٹے دال کی دکان کھول لیتے تو زیادہ کامیاب رہتے۔'' پھر غزل لکھ دی اور اسے میرے حوالے کرتے ہوئے کہا ''آپ کو بھی تو کچھ ہو گیا ہے۔ آپ بھی تو اب ''چلی مشین چلی'' قسم کی نظمیں کہنے لگے ہیں۔'' اور دوسرے دن انہوں نے ''حرف و حکایت'' کے کالم میں ایک فقرے کا آغاز یوں کیا: ''ولی دکنی کی غزل سے احمد ندیم قاسمی کی ''چلی مشین چلی'' تک''۔

نومبر ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند مصنفین نے اپنی انجمن کی دوسری سالانہ

کانفرنس منعقد کی تو مولانا مجلسِ استقبالیہ کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کانفرنس میں انہوں نے جو خطبہ پڑھا وہ اُردو نثر کا ایک شہ پارہ ہے۔ لاہور کی علمی، ادبی اور تاریخی اہمیت کو اتنی خوبصورتی اور نفاست کے ساتھ کم ہی لوگ واضح کر سکے ہیں۔ یہی خطبۂ استقبالیہ اس جھگڑے کا پس منظر بنا جو اُردو ادب کے ایک یادگار مناظرے کی صورت اختیار کر گیا۔ ڈاکٹر تاثیر اور ان کے کوئی درجن بھر شاعر دوست تھے جو روزنامہ ''مغربی پاکستان'' میں مولانا حسرت اور ان کے واسطے سے میاں افتخارالدین، فیض احمد فیض اور مجھ پر برستے تھے۔ اور اِدھر تنہا مولانا تھے جو ''امروز'' میں ''فتولوہار'' کے نام سے صرف چار پانچ اشعار لکھ کر مقابل کی دس دس نظموں کا نہایت بھرپور جواب دیتے تھے۔ نظموں کی یہ لڑائی جاری تھی جب میں ایک روز مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خلافِ معمول بے اعتنائی سے پیش آئے۔ فرمایا ''کہیے مولانا کیسے آنا ہوا؟'' عرض کیا ''قبلہ میں اب تک اس لیے حاضر نہیں ہوا کہ ڈاکٹر تاثیر وغیرہ سے آپ کی جو لڑائی ہو رہی ہے اس میں میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکتا۔ اس لیے کہ میں نے شعر میں طنز و مزاح کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ مگر آج مجھے خیال آیا ہے کہ لڑائی طول کھینچ رہی ہے اور آپ تنہا ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو اس سلسلے میں میں بھی کچھ طبع آزمائی کروں۔'' یہ سنتے ہی ان کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ فرمایا ''مولانا! میں تو آپ ہی کی لڑائی لڑ رہا ہوں اور مجھے آپ لوگوں سے شکایت ہے کہ آپ نے اور فیض نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ بہرحال آپ اپنی مرضی سے آ نکلے ہیں تو مجھے خوشی ہوئی ہے اور میرے دل میں آپ کی قدر بڑھ گئی ہے۔ بیٹھ جائیے اور کچھ کہیے۔'' میں نے ''آورد'' کے تمام ہتھیار استعمال کر کے چند اشعار کہے تو فرمایا ''کوئی ایسی چیز کہیے جس میں بے ساختگی ہو، جسے پڑھ کر یہ محسوس ہو کہ بات آپ کے دل میں سے نکلی ہے۔ کل کچھ کہہ کر لائیے گا۔'' میں دوسرے دن ایک نظم لے گیا تو بہت پسند کی اور اس قسم

کی نظموں کے لیے میرا نام ''سرکوب لاہوری'' تجویز فرمایا۔ بعد میں انہوں نے مولانا سالک صاحب سے بھی ذکر کیا کہ ندیم کے اس تعاون نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی ذرا ذرا سی باتوں سے متاثر ہونے والے دراصل بے حد شریف الطبع لوگ ہوتے ہیں ورنہ ایک طفلِ مکتب کے معمولی سے جذباتی تعاون سے ان کا کیا بھلا ہو سکتا تھا۔ بہر حال بعد میں فیض بھی ان کی مدد کو آ گئے تھے۔

مولانا حسرت سراپا شگفتگی تھے۔ ان کے چہرے سے اس طرح کا قطعاً اندازہ نہیں ہوتا تھا مگر جب بولتے تھے تو طنز اور مزاح کے معیار قائم کر دیتے تھے۔ میرے عزیز ظہیر بابر کی خدیجہ مستور کے ساتھ شادی ہوئی۔ نکاح میرے خالہ زاد بزرگ بھائی مولانا غلام مُرشد نے پڑھا۔ جب نکاح کی رسم پوری ہوئی اور حاضرین ظہیر کو مبارک دینے لگے تو مولانا بولے ''مبارک ہو ظہیر! اب تو اُردو ماشاء اللہ تمہاری مادری زبان ہو گئی!''

''امروز'' کے ایک بزرگ سب ایڈیٹر مولانا کے پاس ایک مضمون لکھ کر لائے کہ اسے قسمتِ علمی و ادبی میں شامل کیا جائے۔ مولانا نے مضمون پڑھا اور پوچھا ''مولانا یہ ہے کیا؟'' سب ایڈیٹر بزرگ نے جواب دیا۔ ''قبلہ! یہ مزاحیہ مضمون ہے۔'' اور مولانا بولے: ''مولانا! پہلے بتا دیا ہوتا تو میں مطالعے کے دوران ذرا سا مسکرانے کی کوشش کرتا۔''

اور یہ تو خیر بہت مشہور واقعہ ہے کہ کافی ہاؤس میں انہوں نے کافی کا آرڈر دیا مگر جب دیر تک کافی ان کے سامنے نہ آئی تو انہوں نے کافی ہاؤس کے مینجر سے شکایت کی۔ مینجر نے پوچھا ''کیا آپ نے اس ویٹر کو آرڈر دیا تھا جس کی داڑھی سفید ہے؟'' مولانا بولے'' جب ہم نے آرڈر دیا تھا تو اس کی داڑھی سیاہ تھی۔ اب سفید ہو چکی ہو تو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔''

اگر میری ان منتشر اور سینکڑوں میں سے صرف چند یادوں سے مولانا حسرت مرحوم کی بوقلموں شخصیت کا کوئی ایک پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے تو میں سمجھتا ہوں میں نے آپ کا وقت ضائع نہیں کیا۔ مجھے مولانا حسرت سے نہ تو دوستی کا دعویٰ ہے نہ ہم نشینی کا۔ ان کا میرا رشتہ صرف عقیدت مندی کا ہے اور عقیدت بے لاگ ہو کر کچھ کہنا چاہے تو یہی کچھ کہہ سکتی ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔

سعادت حسن منٹو

منٹو کے مزاج و کردار کے بارے میں اکثر لوگ شدید غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں جبکہ میں نے اندر باہر سے اتنے صاف ستھرے انسان کم ہی دیکھے ہیں۔ جب تک منٹو سے میری ملاقات نہیں ہوئی' وہ مجھے خطوں میں لکھتا رہا کہ مجھ سے مل کر آپ کو مایوسی ہوگی۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ ایسی باتیں کیوں لکھتا ہے۔ پھر جب منٹو سے ملاقات ہوئی تو نہ صرف یہ کہ مجھے کسی قسم کی مایوسی نہیں ہوئی بلکہ مجھے اس کی شخصیت کے متعدد پہلو نہایت پیارے لگے۔ اس میں اگر کوئی خامی تھی تو صرف یہ تھی کہ وہ شراب کا عادی تھا مگر یہ خامی ایسی تو نہیں تھی کہ مجھے اس سے مایوسی ہوتی۔ ہماری سیاست اور ادب کے بڑے بڑے زعما اس عادت میں مبتلا رہ چکے ہیں مگر ان کی بڑائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دوسری خامی---- اگر اسے خامی کہا جا سکتا ہے---- یہ تھی کہ اس کی انا کی دھار بہت تیز تھی۔ مگر یہ انانیت اس پر بجتی تھی کیونکہ وہ ایک بڑا تخلیق کار تھا۔ منٹو سے ملاقات کے بعد اس کی موت تک کے چودہ پندرہ برسوں میں اس کی شخصیت کے ایسے ایسے خوشگوار پہلو میرے سامنے آئے کہ اس کے مزاج و کردار کے بارے میں شبہات کا اظہار کرنے والوں پر مجھے رحم آتا ہے۔

میں نے اسے ہمیشہ سفید رنگ کے صاف ستھرے کرُتے پاجامے میں دیکھا۔ سرما میں وہ سوٹ بھی استعمال کر لیتا تھا۔ وہ اعلیٰ معیار کے کاغذ پر افسانہ لکھتا تھا اور ہر افسانے کا آغاز ۷۸۶ کے ہندسوں سے کرتا تھا۔ کہتا تھا' یہ اللہ تعالیٰ کا ٹیلی فون نمبر ہے ! اس کے سامنے درجن بھر ترشی ترشائی پنسلیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ میں نے ایک بار پوچھا بھی کہ ایک دم اتنی بہت سی پنسلیں کیوں؟ منٹو نے مجھے بتایا'' لکھتے لکھتے جب پنسل کی نوک موٹی ہو جائے تو اسے تراشنے میں وقت ضائع ہوتا ہے اور سلسلۂ خیال بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ سوگھسی ہوئی پنسل ایک طرف رکھ کر میں دوسری پنسل اٹھا لیتا ہوں۔''

میں تاریخیں یاد رکھنے کے معاملے میں بہت کوتاہ ہوں۔ میرا خیال ہے یہ ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے جب منٹو نے بمبئی کے ایک فلم پروڈیوسر شیراز سیٹھ سے میرا ذکر کیا اور مجھے اس کی آنے والی فلم ''دھرم پتنی'' کے مکالمے اور گانے لکھنے کو کہا۔ اس طرح منٹو نے ایک ضرورت مند دوست کی مدد کی۔ خود اسے اس کام میں کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ اگر کوئی فائدہ اسے ہوا تو اس کا یہ اطمینان تھا کہ اس سے ایک دوست کی چند ضروریات آسانی سے پوری ہو جائیں گی۔ ''دھرم پتنی'' کا مصنف ایک مرہٹہ ادیب ''کھانڈے کر'' تھا۔ میں اُن دنوں ملتان میں ایکسائز سب انسپکٹر تھا۔ منٹو بمبئی میں ایک فلمی ہفت روزہ ''مصور'' کا ایڈیٹر تھا۔ اس ہفت روزہ میں وہ میری غزلیں اور نظمیں ایک آرٹسٹ ''فیض'' سے باقاعدہ مصور کرا کے اور بہت نمایاں کر کے چھاپتا تھا۔ وہاں امرتسر کے آغا خلش کاشمیری اس کے معاون کار تھے۔ اُن دنوں مشہور موسیقار رفیق غزنوی کے ساتھ منٹو کے گہرے مراسم تھے۔ وہ خطوں میں مجھے مطلع کرتا تھا کہ رفیق تمہارے فلاں کلام کی تعریف کر رہا تھا۔ ایک بار منٹو نے مجھے گلبرٹ کا ایک آپرا بھیجا کہ اس کا منظوم اُردو ترجمہ کر دو۔ یہ بمبئی ریڈیو سٹیشن سے نشر ہوگا اور اس کا ہدایت کار رفیق

غزنوی ہوگا۔ میں نے یہ آپرا لکھا۔ منٹو نے اسے بے حساب پسند کیا۔ رفیق غزنوی نے اس کی دھنیں بنا کر اسے نشر بھی کیا۔ مجھے اس کا معاوضہ بھی ملا۔ بعد میں یہ آپرا رسالہ ''ادب لطیف'' میں شائع بھی ہوا۔ شاید اس وقت ''ادب لطیف'' کے مدیر میرے محترم دوست راجندر سنگھ بیدی تھے۔

منٹو نے طے کیا کہ وہ بمبئی سے دہلی آئے گا۔ مجھے مشورہ دیا کہ میں ملتان سے دہلی پہنچوں۔ اس نے مجھے لکھا کہ وہ دہلی کے چاوڑی بازار میں کرپارام کے انگریزی فلمی ہفت روزہ کے دفتر میں میرا انتظار کرے گا۔ میرا تانگہ جب دہلی کے چاوڑی بازار میں داخل ہوا تو ہر دروازے اور ہر دریچے میں مجھے عورتیں بال سکھاتی یا بالوں میں کنگھی کرتی نظر آئیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا' میں نے کوچوان سے پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ وہ سمجھا کہ میں' جو پنجابی شلوار اور شیروانی میں ملبوس تھا' ایک بڑا زمیندار ہوں اور بسلسلۂ عیاشی دہلی آیا ہوں ورنہ ریلوے سٹیشن سے سیدھے طوائفوں کے بازار چاوڑی کا رخ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوچوان نے جواب میں صرف مسکرا دینا کافی سمجھا۔ آخر میں نے کرپارام کے ہفت روزہ کا بورڈ دیکھ لیا۔ اترا اور دفتر میں داخل ہوا تو میں نے منٹو کو فوراً پہچان لیا۔ مجھے دیکھتے ہی گورا چٹا' دبلا پتلا' بڑی بڑی اور ذہین آنکھوں والا صاف ستھرے سفید کرتے پاجامے میں ملبوس نوجوان میری طرف بڑھا۔ ہم نے معانقہ کیا اور یوں گفتگو شروع کی جیسے ہم ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے ہیں۔ تصویروں کے باہمی تبادلے میں ہم نے ایک دوسرے کو ''دیکھ'' بھی لیا تھا اور باہمی خط و کتابت کے ذریعے ایک دوسرے کو پہچانتے بھی تھے۔ شام سے پہلے ہمیں نئی دہلی کے ایک اعلیٰ درجے کے سینما ہاؤس کی بالائی منزل پر منتقل کر دیا گیا۔ وہاں تین کمرے ہماری تحویل میں تھے۔ میں ایک کمرے میں مکالمے لکھتا رہتا تھا۔ ناشتے اور کھانے وغیرہ کا انتظام تسلی بخش تھا۔ وہیں میں نے دیکھا کہ

منٹو وہسکی پیتا ہے مگر یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اتنی نہیں پیتا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ وہ تازہ دم ہونے کے لیے وہسکی کے ایک پیگ سے وہی کام لیتا تھا جو میں چائے کی ایک پیالی سے لیتا تھا۔ میں نے دس بارہ روز کے قیام کے دوران میں اسے کبھی ''آؤٹ'' نہیں دیکھا بلکہ اس حالت میں اس کی ذہانت دوچند ہو جاتی تھی اور وہ بعض ادیبوں اور شاعروں کے اندازِ گفتگو کی نقلیں خوب اتارتا تھا۔ انہی دنوں سینما ہال کے ''بار'' میں عاشق حسین بٹالوی سے ملاقات ہوئی تو منٹو ان کی آواز اور ان کے انداز کی ایسی ہو بہو نقل کرنے لگا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔

میں مکالمے اور گانے لکھنے میں اور وہ میرے مکالمے اور گانے ٹائپ کرنے اور بعض مقامات کی تصحیح میں مصروف تھا' جب منٹو نے ذرا سی تشویش کی حالت میں کہا کہ ''میں 'مصور' کے لیے ہفتۂ رواں کا میٹریل تو دے آیا تھا مگر اب میرے پاس نئے شمارے کے لیے اداریہ اور ادارتی نوٹ اور مزاحیہ کالم ''بال کی کھال'' لکھنے کا وقت ہی نہیں۔ کیوں نہ شاہد لطیف کو بلا لوں۔ وہ علی گڑھ میں موجود ہے اور میرا پرانا دوست ہے۔''

اُس وقت تک شاہد لطیف اور عصمت چغتائی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ شاہد لطیف آیا۔ منٹو نے اسے ''مصور'' کا اداریہ اور کالم لکھنے کے لیے الگ کمرے میں بٹھا دیا اور ہم دونوں اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ دو ایک گھنٹے کے بعد منٹو نے شاہد لطیف سے اس کے کام کی رفتار کا پوچھا تو وہ بولا ''یار منٹو!--- مجھ سے تو ابھی ایک سطر تک نہیں لکھی جا سکی۔ میں نے اس طرح کا کام کبھی نہیں کیا نا''۔ منٹو نے ناگواری سے اس کے سامنے سے کاغذات اٹھائے اور میرے حوالے کر دیئے۔ میں نے دو ڈھائی گھنٹے کے اندر ''مصور'' کا اداریہ اور ادارتی نوٹ اور مزاحیہ کالم ''بال کی کھال'' لکھ کر منٹو کے حوالے کر دیئے تو منٹو نے اس کے

مطالعے کے بعد اعلان کیا کہ ''مزہ آ گیا۔'' پھر شاہد لطیف کو تنگ کرتا رہا کہ پنجابی ذہن کتنا الرٹ اور ترقی یافتہ ہے اور تم اُردو والے کولہو کے بیل ہو---- شاہد سنتا رہا اور ہنستا رہا۔ دو روز کے بعد وہ واپس علی گڑھ چلا گیا۔

ایک اور موقعے پر بھی منٹو کی پنجابیت کی رگ پھڑکی تھی۔ شاہد احمد دہلوی نے جب سنا کہ میں دہلی میں ہوں اور منٹو کے ہاں ٹھہرا ہوں تو انہوں نے ہم دونوں کو اپنے ہاں دعوت پر بلایا۔ اس دعوت میں دہلی کے اُس دور کے سبھی قابلِ ذکر اہل قلم موجود تھے۔ ظاہر ہے شعر و ادب کے موضوعات پر اُردو میں گفتگو ہوتی رہی مگر جب منٹو اور میں آپس میں کوئی بات کرتے تھے تو پنجابی میں کرتے تھے۔ شاہد صاحب نے اس کا برا مانا۔ بولے ''آپ دونوں اُردو کے ادیب ہیں۔ ہم سے اُردو ہی میں بات چیت کر رہے ہیں مگر آپس میں پنجابی بول رہے ہیں----- اُردو بولیے۔'' منٹو کو یہ بات بڑی لگی۔ شاہد احمد سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ''شاہد صاحب! پنجابی اُردو سے زیادہ قدیم زبان ہے اور اس کا ذخیرۂ الفاظ بھی اُردو سے زیادہ ہی ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر میں ایلومونیم کا یہ کٹورا سیمنٹ کے فرش پر گراؤں تو پنجابی میں اسے ''چِب'' پڑ جائے گا۔ اُردو میں کیا پڑے گا؟''---- دوستوں نے اُردو کے ایک سے زیادہ الفاظ پیش کیے مگر سب ''چِب'' کے مقابلے میں ہار گئے اور منٹو اتنا خوش ہوا جیسے اس کے ہاتھ میں فتح کا جھنڈا آ گیا ہے اور وہ اسے ادبائے دہلی کے سروں پر لہرا رہا ہے!

اُس وقت تک منٹو اور کرشن ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے چنانچہ جب کرشن ''نئے زاویے'' کی پہلی جلد مرتب کرنے لگا تو میرے پاس آیا اور منت کی کہ منٹو کا ایک تازہ افسانہ دلوا دو۔ میں نے منٹو سے درخواست کی تو اس نے فوراً اپنا شاہکار افسانہ ''ہتک'' مجھے بھجوا دیا اور کہا کہ لکھنے کے بعد میں نے اسے دیکھا نہیں۔ تم دیکھ لینا۔ کوئی لفظ رہ گیا ہو تو لکھ دینا اور یہ کرشن کے حوالے

کر دینا۔ کرشن یہ افسانہ پا کر بے حد خوش ہوا تھا۔ بعد میں منٹو کو کرشن سے لگاؤ تو یقیناً پیدا ہوگیا مگر اُردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں سے وہ راجندر سنگھ بیدی کو اپنے ذہن کے زیادہ قریب سمجھتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد منٹو آل انڈیا ریڈیو دہلی میں سکرپٹ رائٹر مقرر ہوگیا اور بمبئی سے مستقلاً دہلی آ گیا۔ اس کے پاس ایک پورٹیبل اُردو ٹائپ رائٹر تھا۔ وہ اسے بریف کیس کی طرح اٹھائے پھرتا رہتا۔ ریڈیو سٹیشن پر لکھنے کی بجائے ٹائپ کرتا تھا۔ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ریڈیو سٹیشن کا آئندہ ماہ کا پروگرام مرتب ہو رہا تھا جب منٹو سے پوچھا گیا کہ اس کے آئندہ ریڈیو ڈرامے کا عنوان کیا ہوگا۔ منٹو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا ''کبوتری'' لکھ لیجیے۔ بعد میں اس نے بتایا کہ محض عنوان کے حوالے سے اسے پورا ڈرامہ لکھنا پڑ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اکثر یہی ہوا کہ عنوان پہلے دے دیا اور بعد میں اس عنوان کے گرد ڈرامے کی عمارت تعمیر کی۔

جب منٹو ریڈیو سے وابستہ ہوا تو کرشن چندر، راشد، اوپندر ناتھ اشک اور کئی دوسرے معروف شاعر اور ادیب ریڈیو سروس میں ملازم تھے۔ انھی دنوں منٹو اور کرشن چندر نے ایک فلمی کہانی ''بنجارا'' لکھی۔ اس کا سکرین پلے اور مکالے بھی مکمل کر لیے۔ مجھے ملتان سے اس کے گیت لکھنے کے لیے بلوا بھیجا۔ منٹو کا وہ چھوٹا سا مگر صاف ستھرا مکان مجھے اب تک یاد ہے۔ منٹو جس کمرے میں بیٹھ کر لکھتا تھا وہ مختصر تو تھا مگر انتہائی سادگی اور خوش ذوقی کا نمونہ تھا۔ منٹو میز کرسی کی بجائے فرش پر بیٹھ کر اور سامنے ایک ڈیسک رکھ کر لکھتا تھا۔ ڈیسک کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ اس میں وہسکی مقفل کر دیتا تھا۔ اُن دنوں منٹو کی بڑی بہن اس کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ان کی چھوٹی سی پیاری سی بیٹی جب بھی ماموں ماموں پکارتی ہوئی آتی تو وہسکی کی بو فوراً سونگھ لیتی اور کہتی ''ماموں گندے، ماموں

گندے!'' منٹو گھبرا کر کوئی چیز اس کے حوالے کر کے کمرے سے نکال دیتا اور کہتا ''یہ لڑکی مجھے باجی کے سامنے شرمندہ کرائے گی!''

بنجارا کے میوزک ڈائریکٹر فیروز نظامی تھے۔ وہ بھی ریڈیو ہی سے متعلق تھے۔ انہوں نے میرے لکھے ہوئے گانے بہت پسند کیے۔ بہزاد لکھنوی بھی ریڈیو سے وابستہ تھے۔ جب انہوں نے میرے لکھے ہوئے گیت سنے اور منٹو نے بتایا کہ ندیم نے دو دنوں میں یہ دس خوبصورت گیت لکھ ڈالے ہیں تو بہزاد صاحب کو یقین نہیں آتا تھا۔ البتہ جب کرشن چندر نے تائید کی تو تب انہوں نے میرے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

اب منٹو' کرشن اور مجھے ''منورنجن پکچرز'' کے مالک سیٹھ کے پاس جا کر یہ گیت سنانے تھے اور کہانی' مکالموں اور گیتوں کا مشترکہ چیک وصول کرنا تھا۔ اُن دنوں روپے کی قیمت آج کے روپے سے ایک سو گنا زیادہ تھی چنانچہ ہمیں کہانی' مکالموں اور گانوں کے دو ہزار روپے ملنے تھے اور یہ خاصی بڑی رقم تھی۔ منٹو نے مجھے سمجھایا کہ ''اگر سیٹھ کسی لفظ پر تمہیں ٹوکے تو فوراً مان جانا۔ تم شاعروں کی انا بہت تیز ہوتی ہے۔ اس سے بحث نہ کرنے لگنا ورنہ معاوضے کی رقم کھٹائی میں پڑ جائے گی۔ وہ جو بھی کہے' تم کہنا کہ آپ کا ارشاد بالکل درست ہے!''

سیٹھ نوجوان تھا مگر اس پر چربی اتنی افراط سے چڑھی ہوئی تھی کہ اس کی ٹھوڑی سے اس کے گھٹنوں تک ایک خاصا بڑا گنبد ابھرا ہوا تھا۔ میں نے گیت سنائے۔ اس نے پسند کیے مگر ایک لفظ پر اٹکا۔ بولا ''تمنا ومنا کو چھوڑو۔ یہاں آشا رکھو' تمنا کو سینما ہال کی چھوٹی کلاس والا نہیں سمجھے گا۔'' میں نے منٹو کے مشورے کے مطابق کہنا چاہا کہ آپ کا ارشاد درست ہے مگر مجھ سے پہلے منٹو بول پڑا۔ ''سیٹھ صاحب یہاں تمنا ہی ٹھیک ہے۔ جس چیز کا علم نہ ہو اس پر نہیں بولا

کرتے۔ یہ شاعری ہے، کھتونی نہیں ہے، آشا واشا نہیں چلے گا۔ تمنا ہی ٹھیک ہے اور اگر نہیں ٹھیک ہے تو ہمیں اجازت دیجئے۔'' سیٹھ گھبرا گیا۔ بولا ''تم بات بہت چیخ کر کرتا ہے منٹو۔ اور اتنی بڑی بڑی آنکھیں نکال کر کرتا ہے کہ تم سے ڈر لگتا ہے۔ چلو تمنا ہی رہنے دو۔ آگے چلو۔'' دو ہزار روپے کا بیئرر چیک لے کر ہم سیٹھ کے بنگلے سے نکلے تو منٹو نے اسے فوراً کیش کرانے کے عزم کا اظہار کیا۔ کرشن نے کہا کہ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ کل کیش کرا لیں گے جبکہ ندیم کو ابھی تین چار روز کے بعد رخصت ہونا ہے۔ مگر منٹو بولا ''تم فلمی سیٹھوں کی ذہنیت سے واقف نہیں ہو۔ کیا پتہ وہ اپنی نیت بدل لے۔ ایک منٹ کی تاخیر کا خطرہ بھی مول نہیں لینا چاہیے۔ اور پھر مجھے ندیم کو اس گھیرے دار شلوار اور اس مولویانہ شیروانی سے بھی چھٹکارا دلانا ہے۔ ندیم کے حصے کی رقم سے اس کے لیے کوٹ پتلون کا کپڑا خرید کر فوراً ٹیلر ماسٹر کے حوالے کرنا ہے۔ یہ اتنی بھاری شلوار پھڑکاتا ہوا جب ہمارے ساتھ چلتا ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ بڑا جاگیردار ہے اور ہم اس کے مزارعے ہیں!''

چاندنی چوک کے ایک بنک سے چیک کیش کرایا گیا۔ برابر برابر تقسیم کا مرحلہ آیا تو منٹو نے کہا کہ ہم مقامی ہیں اس لیے کرشن اور میں چھ سو ساٹھ، چھ سو ساٹھ لیں گے۔ ندیم ملتان سے آیا ہے اس لیے اس کے حصے میں چھ سو اسی روپے آئیں گے۔ پھر ہم تینوں کپڑے کی ایک دکان پر گئے۔ میرے لیے کوٹ پتلون کا کپڑا خریدا گیا۔ پھر یہ کپڑا درزی کے حوالے کیا گیا اور جب ہم منٹو کے گھر پہنچے تو وہاں سیٹھ صاحب کا منشی موجود تھا۔ وہ بولا ''سیٹھ نے کہا ہے ہم نے فلم بنانے کا پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔ چیک واپس کر دیجئے۔ خبر ہے کہ جاپان بھی جنگ میں کود پڑا ہے اور اس نے پرل ہاربر پر امریکہ کے سمندری جہازوں کی ایسی تیسی پھیر دی ہے۔'' تب منٹو نے فاتحانہ انداز سے ہم دونوں کی طرف

دیکھا۔ پھر سیٹھ کے منشی سے کہا ''سیٹھ سے کہو کہ اس کے چیک کی پرل ہاربر پر بھی حملہ ہو چکا ہے اور وہ کیش ہو کر خرچ بھی ہو چکا ہے----'' اور کرشن اور میں حیران ہوتے رہے کہ منٹو کس بلا کا دور اندیش ثابت ہوا ہے!

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے جدید اُردو شعرا کو اپنے ہاں مدعو کیا اور ایک یادگار مشاعرہ براڈ کاسٹ کیا۔ اس مشاعرے میں جو شعرا شامل تھے ان میں سے مجھے جن اصحاب کے نام یاد ہیں وہ یہ ہیں: فیض، راشد، میراجی، تاثیر، حفیظ جالندھری، تصدق حسین خالد، اسرار الحق مجاز، روش صدیقی۔ میں بھی مدعو تھا۔ میں نے اپنی ابتدائی نظم ''نیا ساز، نئی تان'' پڑھی۔ مشاعرے کے بعد منٹو جہاں بھی بیٹھتا تھا، یہی اعلان کرتا تھا کہ ندیم کی نظم سب سے بہتر تھی۔ یہ سب منٹو کی محبت کی کارفرمائی تھی۔

اس مشاعرے سے پہلے مدعو شعرا کے اعزاز میں پطرس بخاری مرحوم نے (جو اُس وقت آل انڈیا ریڈیو کے شاید ڈائریکٹر جنرل تھے) ریڈیو سٹیشن کے وسیع لان میں ایک ظہرانہ دیا۔ دہلی کے تمام قابل ذکر اہل قلم اور بے شمار امراء و رؤسا وہاں موجود تھے۔ ایک الگ میز پر منٹو، کرشن، میراجی، راشد اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ میں بھی موجود تھا۔ اچانک منٹو نے حفیظ جالندھری کا ذکر چھیڑ دیا اور بولا: ''اسے اپنے بڑا ہونے کا بہت زعم ہے۔ میں اس کا یہ زعم توڑنا چاہتا ہوں۔ اس نے اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے مجھے یوں مخاطب کیا ہے جیسے میں ابھی سکول کا بچہ ہوں اس نے مجھے ''منٹو صاحب'' کہنے کی بجائے کہا: ''کیسے ہو برخوردار سعادت''---- یعنی میں ابوالاثر ہوں اور تم برخوردار ہو۔ ذرا دیکھنا میں اس کی کیسے خبر لیتا ہوں'' یہ کہہ کر وہ اس مرکزی میز کے پاس گیا جہاں بخاری صاحب کے ساتھ حفیظ صاحب اور دیگر سینئر شعرا کے علاوہ دہلی کے شرفا بھی موجود تھے۔ وہ چھوٹتے ہی بولا ''حفیظ صاحب آپ کے ایک شعر نے مجھے

بہت دنوں سے پریشان کر رکھا ہے۔ اس میں اتنی گہرائیاں اور ساتھ ہی اتنی بلندیاں ہیں کہ میرا ذہن اس کے مفہوم کو گرفت میں لانے سے قاصر ہے۔ مجھے تو یہ فلسفیانہ شعر معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہو تو مجھے اس کا مطلب سمجھا دیجئے۔'' حفیظ صاحب منٹو کے اس اسلوب گفتگو سے بہت خوش ہوئے۔ بولے ''ہاں برخوردار سعادت! بولو۔ وہ شعر کون سا ہے؟'' اور منٹو بولا ''شاہنامۂ اسلام کا شعر ہے مگر نہایت گنبیھر ہے۔ اور شعر یہ ہے:

یہ لڑکا جو کہ لیٹا ہے' وہ لڑکی جو کہ لیٹی ہے
یہ پیغمبر کا بیٹا ہے' وہ پیغمبر کی بیٹی ہے !

حفیظ صاحب فوراً منٹو کی نیت تک پہنچ گئے۔ اٹھ کھڑے ہوئے اور خود اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگے۔ بخاری صاحب نے بڑی مشکل سے انہیں خاموش کرایا اور منٹو ہمارے پاس واپس آ کر بولا: ''برخوردار سعادت کا کمال دیکھا!''

اسی طرح ایک بار اسے مولانا چراغ حسن حسرت کو چھیڑنے کی سوجھی۔ مولانا اُردو خبروں کے شعبے سے وابستہ تھے۔ منٹو' کرشن' میرا جی' دو ایک دوسرے اصحاب اور میں مولانا کے پاس پہنچے۔ انہوں نے ہماری مدارات کی۔ چائے منگوائی' اور ہماری سعادت مندی کی تعریف کرنے لگے۔ تب منٹو نے انہیں چھیڑنے کے لیے مودبانہ عرض کیا۔ ''حسرت صاحب! یہ جو علامہ اقبالؒ کی شاعری ہے' تو کیا یہ واقعی شاعری ہے؟ مجھے تو وعظ سا معلوم ہوتی ہے۔'' بس پھر کیا تھا' حسرت صاحب نے منٹو کو اور ساتھ ہی ہم سب کو ایسی کھری کھری سنائیں اور علامہ اقبالؒ کی عظمتوں کا ایسا قصیدہ پڑھا کہ ہم ان کی مدارات کو ادھورا چھوڑ کر بھاگ آئے۔

مولانا چراغ حسن حسرت اور منٹو کے درمیان مجھے ایک اور چپقلش یاد آ رہی ہے۔ فیض صاحب ایم۔اے۔او کالج امرتسر کے طلبا کی ایک ٹیم کو علی گڑھ

یونیورسٹی دکھانے جا رہے تھے۔ دہلی میں رُکے تو منٹو نے ان کے اعزاز میں ایک ہوٹل میں ایک محفل ناؤنوش برپا کی۔ دہلی ریڈیو سے وابستہ سبھی شعرا و ادبا وہاں موجود تھے۔ شراب نوشی کا آغاز ہوا تو مولانا حسرت نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ نہیں پیتے؟'' میں نے عرض کیا ''جی نہیں۔'' بولے ''ہاں، آپ تو مسجد شاہی کے خطیب مولانا غلام مرشد کے بھائی ہیں نا۔ بہرحال آپ اگر اس محفل کفار میں شریک ہیں تو کوئی کام اپنے ذمے لیجیے۔ سوڈے کی بوتلیں ہی کھول کھول کر ہمیں پیش کیجیے۔'' یوں خوشگوار ماحول میں اس محفل کا آغاز ہوا۔ جب گپ شپ عروج پر پہنچی تو حسرت صاحب نے فرمایا ''خوش قسمتی سے اتنے اچھے اچھے شاعر موجود ہیں۔ ایک ایک غزل ہو جائے۔'' شعرا کے غزلیں سنانے کا دور ختم ہوا تو حسرت صاحب نے کہا ''ایک ایک غزل اور۔'' منٹو بولا ''نہیں، غزل نہیں، اب نظم کا دو ر ہے۔ آخر راشد سے بھی تو کچھ سننا ہے۔'' حسرت صاحب بولے ''وقت آنے والا ہے جب آگے آگے قافیہ ہوگا اور پیچھے پیچھے راشد صاحب لپکے آ رہے ہوں گے مگر قافیہ انہیں پکڑائی نہیں دے گا۔ جب وہ قافیہ پکڑ لیں گے تو ان سے بھی غزل سن لیں گے۔ فی الحال ایک ایک غزل اور ہو جائے۔'' منٹو نے ضد کی کہ نہیں، اب نظم ہوگی، حسرت صاحب گرجے ''غزل ہوگی۔'' منٹو کڑکا ''نظم ہوگی۔'' دونوں نے غزل ہوگی، نظم ہوگی کی رٹ لگا دی اور بدقسمتی سے دونوں مجھ سے مخاطب تھے۔ کہیں تحت الشعور میں وہ جانتے تھے کہ محفل میں صرف یہ شخص ہوش میں ہے۔ دونوں شدید غصے میں تھے۔ منٹو کشمیری ہونے کے باوجود بولا ''اگر میرے پاس کوئی ایسی کیمیائی چمٹی ہو جس کی مدد سے میں تمہارے دماغ میں سے رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد کے سارے محاورے اور روزمرے نکال دوں، تو تم سیدھے سادے ''ہاتو'' بن کر رہ جاؤ۔'' تب حسرت صاحب نے کہا۔ ''سومرسٹ مائم کے نقلچی! دو چار افسانچے کیا لکھ لیے کہ ہم بڑوں کے منہ آتے ہو---''

تب میں نے حسرت صاحب کی منت کی کہ خدارا غصہ تھوک دیجئے۔ پھر منٹو سے عرض کیا کہ سارا ہوٹل آپ کی تیز دھار آواز سے گونج رہا ہے اور مہمانِ خصوصی فیض صاحب کی پوزیشن خراب ہو رہی ہے۔ اور پھر کچھ بھی ہو حسرت صاحب عمر میں تو آپ کے سینئر ہیں۔ تب میں دونوں کا معانقہ کرانے میں کامیاب ہوگیا اور قہقہوں کے درمیان یہ دعوت ختم ہوئی۔

ریڈیو سٹیشن پر بھی لوگ منٹو سے محبت کرتے تھے مگر وہ سبھی کو چھیڑنے سے باز نہیں آتا تھا۔ ایک بار ن۔م۔راشد سے کہنے لگا "تم جب کہتے ہو کہ اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے' تو کیا کبھی تم نے مغربی رقص کیا ہے؟ میں نے کہا ہے اس لیے آؤ۔ میرے ساتھ دو چار سٹپس (Steps) رقص کرو۔ ابھی بھرم کھل جائے گا۔" کرشن چندر پر نظر پڑتی تھی تو کہتا تھا "یہ شخص ہر انسان کو خوش رکھنا چاہتا ہے۔ بھئی کسی کے ساتھ تو تھوڑی بہت کشیدگی بھی ہونی چاہیے۔ کرشن تم تو ادیبوں کے مہاتما بدھ ہو!" اوپندر ناتھ اشک پر جب بھی نظر پڑتی تھی منٹو پنجابی لہجے میں کہتا "اشکے اوئے اشکے!"---- ایک روز میں منٹو کے گھر میں اس کے پاس بیٹھا تھا جب اس دور کا ایک معروف شاعر وشوامتر عادل مجھ سے ملنے آیا' بولا "جب میں نے سنا کہ آپ دہلی آئے ہوئے ہیں اور منٹو کے ہاں ٹھہرے ہیں تو میں ایک لفظ کا تلفظ معلوم کرنے حاضر ہوگیا۔ یہ بتائیے کہ لفظ گنڈیری ہے یا ڈال پر تشدید ہے اور اسے گنڈّیری لکھنا چاہیے۔" منٹو نے پوچھا کہ یہ لفظ کہاں استعمال کرو گے عادل نے بتایا کہ یہ لفظ اس کی ایک نظم میں وارد ہو رہا ہے۔ عادل بھی شاید ریڈیو ہی سے وابستہ تھا اس لیے منٹو بے تکلفی سے بولا "احمق آدمی! جس نظم میں تم گنڈیری لاؤ گے' وہ بھی کوئی نظم ہو گی؟ تم شاعری کی بجائے گنڈیریوں کا خوانچہ کیوں نہیں لگا لیتے!"

میں ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا ریڈیو پشاور سے وابستہ ہوگیا۔ وہاں میرا کام

وہی تھا جو دہلی ریڈیو میں منٹو انجام دیتا رہا تھا۔ قیامِ پاکستان سے کچھ پہلے یا کچھ بعد منٹو لاہور آ گیا تو مجھے لکھا کہ وہ ایک دوست کے ہمراہ پشاور آ رہا ہے۔ وہ آیا اور اپنے دوست کے ساتھ میرے پاس ہی ٹھہرا۔ ان کا یہ دوست امرتسر کے ایک معروف کاروباری خاندان کا فرد تھا۔ ان دونوں نے شاید کسی الاٹمنٹ کے سلسلے میں پشاور کا سفر اختیار کیا تھا۔ میں نے منٹو کی ہر ممکن مدارات کی اور شام سے پہلے اس کے لیے وہسکی کا بھی بندوبست کیا۔ اس کے بعد وہ جب بھی مجھ سے ملا' یہی کہتا تھا کہ ''آخر وہسکی کی بوتل خریدنے کا جرمانہ تمہیں کیوں ادا کرنا پڑے جب کہ تم ایک قطرہ چکھنے کے بھی گنہگار نہیں ہو۔ میرے حالات سدھر جائیں تو میں تمہیں وہسکی کی اس پشاور والی بوتل کی قیمت ہر صورت میں ادا کروں گا۔'' میں نے ہمیشہ منت کی کہ منٹو صاحب' آپ مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹتے ہیں۔ اور وہ کہتا تھا کہ ''کانٹوں میں تو میں گھسٹ رہا ہوں!'' ہم سب جانتے ہیں کہ کسی بھی شراب نوش سے اس انتہا کی خوش اخلاقی کی توقع نہیں کی جا سکتی' مگر یہ منٹو تھا۔ منفرد اور سربرآوردہ۔ وہ پشاور میں تین روز میرے ہاں رُکا۔ میرے ہمراہ ریڈیو سٹیشن پر بھی جاتا رہا۔ وہاں کے ڈائریکٹر سجاد سرور نیازی سے بھی اس کا تعارف تھا اور پھر وہاں ن۔م۔راشد اور حمید نسیم بھی موجود تھے۔ دلچسپ محفلیں رہیں' میرے اندازے کے مطابق منٹو الاٹمنٹ کی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا ورنہ اسے گزر بسر کے لیے بعد میں اپنے افسانے اونے پونے نہ بیچنے پڑتے۔

میں بھی ۱۹۴۸ء کے شروع میں لاہور آ گیا۔ یہاں میں نسبت روڈ پر اپنی منہ بولی بہنوں ہاجرہ سرور اور خدیجہ مستور کے خاندان کے ساتھ' اس خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے پندرہ سولہ برس مقیم رہا۔ منٹو یہاں کئی بار مجھ سے ملنے آیا۔ میں ۱۹۴۸ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین پنجاب کا سیکرٹری تھا۔ منٹو

کے ہاں میں جب بھی گیا' وہاں محمد حسن عسکری کو موجود پایا۔ عسکری ترقی پسند ادب کی تحریک کے سخت مخالف تھے اس لیے مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ روشن خیال منٹو کو فرانس کے منفیت پسندوں اور لایعنیت نوازوں سے متاثر کرنے کی کوشش کریں گے' چنانچہ میں نے پشاور سے فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی ادارت میں شائع ہونے والے مشہور ادبی رسالے ''سنگِ میل'' میں ''منٹو کے نام'' ایک کھلا خط لکھا جس میں منٹو کی حیرت انگیز تخلیقی صلاحیتوں کے اعتراف کے ساتھ ہی میں نے اسے خبردار کیا کہ وہ عسکری کے بے معنویت اور ساتھ ہی ماورائیت کے رجحانات سے متاثر نہ ہو۔ منٹو میرا یہ خط پڑھے بغیر' غصے میں بھرا ہوا میرے ہاں آیا۔ اس نے اندر کمرے میں بیٹھنے سے بھی انکار کر دیا۔ دروازے ہی میں کھڑے کھڑے اس نے اپنی چیختی ہوئی آواز میں کہا ''تم نے مجھے کھلا خط لکھا ہے نا احمد ندیم قاسمی' میں تمہارے نام بند چٹھی لکھوں گا۔'' (وہ مجھے ہمیشہ میرے پورے نام سے مخاطب کرتا تھا) میں نے کہا کہ آپ جو چاہیں لکھیں مگر کیا آپ نے میرا یہ خط پڑھا بھی ہے؟ معلوم ہوا کہ اس نے خط تو نہیں پڑھا مگر اسے اس کے بعض دوستوں نے بتایا ہے کہ میں نے اس خط میں اس کے خلاف زہر اگلا ہے۔ میں لپک کر ''سنگِ میل'' کا وہ شمارہ اٹھا لایا جس میں منٹو کے نام میرا خط چھپا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اسے پڑھنے کے بعد جو چاہیں کہیے گا یا لکھیے گا۔ منٹو رسالہ لے گیا۔ دو تین روز کے بعد میں خود لکشمی مینشنز میں اس کے گھر گیا اور پوچھا ''میرا کھلا خط پڑھ لیا آپ نے؟'' منٹو کے چہرے پر سکون تھا اور آسودگی کی مسکراہٹ تھی۔ بولا ''ہاں پڑھ لیا۔ نرا فراڈ ہے!'' (فراڈ منٹو کا محبوب لفظ تھا) میں سمجھ گیا کہ منٹو میرا خط پڑھ کر خوش ہوا ہے۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا اور چائے سے میری مدارات کی۔ کہنے لگا مجھے اتنا کمزور نہ سمجھو کہ میں عسکری کی منفیت پسندی کے وعظ یا تمہارے ترقی پسندی کے لیکچر سے

متاثر اور مرعوب ہو سکتا ہوں۔ میں وہی لکھتا رہوں گا جو میں دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں۔ عسکری شریف آدمی ہے' دروازے پر آواز آتی ہے ''میاؤں'' یعنی میں آ جاؤں۔ کچھ دیر وہ میری کسی ننھی بچی سے لاڈ پیار کرتا ہے۔ پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے ''میاؤں'' یعنی میں جاؤں!---- اور تم کہتے ہو کہ وہ مجھے بھٹکا رہا ہے؟''----

اُس روز میں نے منٹو کو بہت خوش دیکھا۔ اس نے ایک واقعہ بھی سنایا:

''ایک عقیدت مند میرے پاس روزانہ آتا ہے اور میرے سارے سگریٹ پی جاتا ہے۔ آج میں بیڈن روڈ سے سگریٹ کا نیا پیکٹ خرید کر گھر آیا تو فوراً بعد دروازے پر سے اس عقیدت مند کی آواز آئی۔ میں نے سگریٹوں کا نیا نویلا بھرا ہوا پیکٹ نیچے فرش پر پھینک دیا۔ پھر اسے اندر بلایا۔ بیٹھتے ہی اس نے سگریٹ طلب کیا۔ میں نے کہا پیکٹ ابھی ابھی ختم کر کے پھینکا ہے۔ وہ پڑا ہے۔ وہ بولا ''کوئی بات نہیں' کبھی کبھار سگریٹ پئے بغیر بھی آپ سے گفتگو کرنی چاہیے۔'' وہ گفتگو کرتا رہا۔ پھر جانے کے لیے اٹھا۔ دروازے پر جا کر پلٹا اور فرش پر پڑا ہوا سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر یہ کہتے ہوئے جیب میں ڈال لیا۔ ''بچے کھیلیں گے----'' ہم دونوں اس واقعے پر خوب ہنسے اور بعد میں ہماری اس ہنسی میں صفیہ بھابھی بھی شامل ہو گئیں۔

میں منٹو کی صفائی پسندی کا ذکر تو کر چکا ہوں۔ ایک روز وہ میرے گھر آیا۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا جو آج کل شاعر خالد احمد کا ڈرائنگ روم ہے۔ سگریٹ پیتے ہوئے اس نے کمرے کی دیواروں کو حیرت سے دیکھا اور بولا ''یہ سفیدی کس نے کی ہے؟'' میں نے کہا ''سفیدی کرنے والے نے کی ہے۔ اور کون کرتا۔'' منٹو نے کہا ''نہایت نالائق آدمی تھا کہ جہاں جہاں سے برش گزرا' اپنے نقوش چھوڑتا چلا گیا۔ سارے کمرے کا ناس مار دیا اس کم بخت

نے۔ تم شاعر ہو کر بھی ایسے بیہودہ کمرے میں بیٹھے ہو۔ اِدھر آؤ میرے ساتھ۔''
منٹو اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے بازو سے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ ''چلو آؤ۔'' میں نے پوچھا
''کہاں منٹو صاحب؟'' بولا ''تم چلو تو سہی۔'' وہ مجھے اپنے گھر لے آیا اور
ڈرائنگ روم کی دیواریں دکھا کر بولا ''اسے کہتے ہیں سفیدی۔'' واقعی دیواروں پر
نہایت معیاری سفیدی ہوئی تھی۔ پھر منٹو نے کہا ''جانتے ہو یہ سفیدی کس نے
کی؟ میں نے کی۔'' میں نے شبہے کا اظہار کیا تو وہ اندر سے صفیہ بہن کو بلا لایا
انہوں نے کہا۔ ''یہ سفیدی سعادت ہی نے کی ہے۔ میں روکتی رہی مگر وہ کہتے
رہے کہ دیکھتی جاؤ۔ ایسی نفیس سفیدی کروں گا جیسا نفیس افسانہ لکھتا ہوں۔'' اور
منٹو میرے افسانوں کا حوالے دیئے بغیر بولا۔ ''اور میں ندیم کے ہاں ایسی سفیدی
دیکھ کر آ رہا ہوں جیسے کسان نے کھیت میں ہل چلایا ہو!''

صفیہ بہن نے میرا بہت دفاع کیا مگر ان کی کوشش بیکار رہی کیونکہ
انہوں نے میرے کمرے کی سفیدی دیکھی نہیں تھی۔ اس سے چند سال پہلے بھی
صفیہ بہن نے دہلی میں بڑی استقامت سے میرا دفاع کیا تھا مگر منٹو کے سامنے
انہیں اور مجھے ہتھیار ڈال دینا پڑے تھے۔ میری افسانہ نگاری کے ابتدائی دن
تھے۔ میں رسالہ ''ساقی'' (دہلی) کے لیے اپنا ایک افسانہ ''السلام علیکم'' ساتھ لایا
تھا۔ شاہد صاحب کے ہاں جانے سے پہلے منٹو نے اسے پڑھا مگر اس کا آخری
پیرا پڑھ کر مجھ سے باقاعدہ الجھنے لگا۔ ''یوں ختم کیا جاتا ہے اتنا عمدہ افسانہ؟ یوں
بیڑا غرق کیا جاتا ہے ایسی اچھی تحریر کا؟ تم نے تو انجام تک پہنچ کر سارے
افسانے کا ناس مار دیا۔'' صفیہ نے منٹو کی اس تنقید کا بہت برا مانا۔ ایک تو میں ان
کا مہمان تھا۔ پھر منٹو کا ہم سن افسانہ نگار تھا۔ صفیہ بہن منٹو سے لڑائی پر تل گئیں۔
میں نے بھی اپنا نقطۂ نظر واضح کیا مگر منٹو نے ہماری ایک نہ مانی اور قلم ہاتھ میں
لے کر میرے افسانے کا آخری صفحہ لکھ ڈالا۔ پھر بولا ''اب پڑھو۔'' میں نے پڑھا

تو واقعی افسانہ تاثر کے لحاظ سے کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ (منٹو کا مکمل کیا ہوا میرا یہ افسانہ میرے افسانوں کے مجموعے ''بگولے'' میں شامل ہے)۔

میں ''نقوش'' کے لیے منٹو سے افسانہ لینے گیا تو اس نے دو تازہ افسانے میرے حوالے کر دیئے۔ ایک ''ٹھنڈا گوشت'' اور دوسرا ''کھول دو----'' بولا'' دونوں پڑھ لو۔ جو اچھا لگے وہ لے جاؤ۔ اگر ان میں سے کسی کے خلاف' مقدمے کا خوف ہو تو یہ خوف ابھی سے ختم کر دو کیونکہ میں نے اپنے عزیز پروفیسر سعید اللہ سے بات کر رکھی ہے جو اسلامیہ کالج میں نفسیات کے استاد ہیں۔ وہ ہائی کورٹ تک میرا تمہارا دفاع کریں گے۔'' میں نے ''کھول دو' پسند کیا اور اسے ''نقوش'' میں شائع کر دیا۔ اس کے خلاف مقدمہ تو نہ چلا البتہ ''ادب لطیف'' اور ''سویرا'' کے ہمراہ ''نقوش'' کو بھی سیفٹی ایکٹ کے تحت چھ ماہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ ہر خیال کے ادیبوں نے اس بندش کی مخالفت کی۔ محمد حسن عسکری نے بھی پابندی اٹھوانے کی جدوجہد میں ہمارا ساتھ دیا۔ منٹو' عسکری اور میں حکومت کی پریس برانچ والوں سے بھی ملے مگر حکومت نے پابندی جاری رکھی۔

نومبر ۱۹۴۹ء میں لاہور کے اوپن ایئر تھیٹر میں کل پاکستان انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس میں انتہا پسندوں نے انتہا کر دی۔ جن بہت سے نامور ادبا و شعرا کے بائیکاٹ کی قرارداد' میری انفرادی مخالفت کے باوجود' منظور کی گئی اس میں منٹو کا نام بھی شامل تھا۔ (عصمت کا نام شامل نہیں تھا۔ عصمت تو ترقی پسند ادب کی تحریک میں عملاً شامل تھیں۔ ان کے بائیکاٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا)۔

منٹو نے اس بائیکاٹ کا شدید اثر لیا۔ ایک تو اس لیے کہ میں' اس کا دوست اس کانفرنس میں انجمن کا جنرل سیکرٹری منتخب ہوا تھا۔ اور پھر اس لیے بھی

کہ قرارداد کے ذریعے منٹو کو بالواسطہ طور پر فحش نگار اور رجعت پسند قرار دے ڈالا گیا تھا۔ میں منٹو کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا تھا۔ منٹو بھی محمد حسن عسکری کی معیت میں ایک رسالہ ''اُردو ادب'' مرتب کرنے لگا اور اس کے پہلے ہی شمارے میں میری شاعری کے خلاف یوسف ظفر کا ایک مضمون شائع کر دیا جس میں یوسف ظفر نے میرے مجموعہ کلام ''جلال و جمال'' میں شامل میری تصویر کو بھی ہدف بنایا تھا اور لکھا تھا کہ میں تصویر میں کیمرے کی طرف نہیں دیکھ رہا اس لیے ثابت ہوا کہ میں نے حقائق سے فرار اختیار کر رکھا ہے۔ ایک تقریب میں منٹو سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس تنقید کی مضحکہ خیزی کا ذکر کیا۔ منٹو نے جواب دیا ''تم بائیکاٹ کی مضحکہ خیز قراردادیں منظور کراؤ گے تو ہم بھی تم پر مضحکہ خیز تنقید کریں گے۔'' میں نے منٹو کو یقین دلایا کہ میں جنرل سیکرٹری ہونے کے باوجود اس قرارداد کا مخالف تھا' البتہ اکثریت کا ساتھ دینا پڑا۔ مگر منٹو یہ جواز ماننے کو تیار نہ تھا۔ پھر جب انجمن نے کراچی میں ۱۹۵۲ء کی کل پاکستان کانفرنس میں یہ قرارداد 'باقاعدہ واپس لے لی تو منٹو کا غصہ خاصا کم ہوا اور پھر سے ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔

چند ملاقاتیں یادگار ہیں۔ ایک دن منٹو کسی کام سے میرے گھر آیا۔ اُس وقت عبدالمجید بھٹی مجھے اپنے ایک ناول کا ایک باب سنا رہے تھے۔ منٹو نے مجھ سے بات کی اور جانے کے لیے اٹھا تو بھٹی نے کہا ''منٹو صاحب کچھ دیر تشریف رکھیے۔ میری شاعری سے تو کتابوں کے ناشرین واقف ہیں مگر انہیں معلوم نہیں کہ میں فکشن بھی لکھتا ہوں۔ میں ندیم صاحب کو اپنے ناول کا ایک باب سنا رہا ہوں کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو کسی ناشر سے اس ناول کی اشاعت کا بندوبست کرا دیں۔ آپ بھی سن لیجیے اور مجھے مشورہ دیجئے کہ کیا میرا اسلوب درست ہے یا قابلِ اصلاح ہے۔''

منٹو بولا ''بھئی صاحب ! مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ جب سناتے ہیں تو سناتے ہی چلے جاتے ہیں اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں احمد ندیم قاسمی کی طرح احمق نہیں ہوں کہ آپ کے پھیر میں آ جاؤں۔'' منٹو تو یہ کہہ کر چلا گیا اور مجھے دیر تک بھئی سے معذرتیں کرنے کے لیے چھوڑ گیا۔

ایک اور ملاقات یوں ہوئی کہ منٹو نے میرے گھر کی گھنٹی بجائی۔ میں اپنے کمرے میں سے اتر کر اس کے پاس آیا تو اس نے مجھ سے پندرہ روپے طلب کیے۔ اس نے بتایا کہ اسے اپنی ایک بچی کی دوا خریدنی ہے۔ میں بھی ان دنوں بالکل پھانک ہو رہا تھا۔ میں نے منٹو کو بتایا کہ میرے پاس تو اس وقت صرف ایک آدھ روپیہ ہوگا۔ میں نے اس کی منت کی کہ وہ چند لمحے بیٹھے، میں محلے میں کسی سے یہ رقم مانگ لاتا ہوں۔ مگر منٹو رُکا نہیں، بولا ''مجھے معلوم ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو اس لیے میں تمہیں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے لیے نہیں جانے دوں گا۔ میں کچھ اور بندوبست کر لیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر منٹو چلا گیا۔

فوراً بعد شباب کیرانوی میرے گھر آ نکلا۔ وہ اُس زمانے میں ایک فلمی رسالے ''ڈائریکٹر'' کا ایڈیٹر تھا۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس نے جیب میں سے پچیس روپے نکال کر میز پر رکھ دیئے اور بولا ''ڈائریکٹر کا سالنامہ نکال رہا ہوں۔ اس کے لیے آپ کا افسانہ درکار ہے۔'' میں نے کہا ''شباب صاحب ! اول تو میرے پاس کوئی نیا افسانہ ہے نہیں اور اگر ہوگا بھی تو میں اسے فلمی رسالے 'ڈائریکٹر' میں کیوں شائع کراؤں گا' کسی ادبی رسالے کو کیوں نہیں دوں گا۔'' مگر شباب نے میری بات نہ مانی۔ بولا ''معاوضہ پیشگی رکھے جا رہا ہوں۔ افسانہ لے کر رہوں گا۔ ہفتے بھر کے بعد پھر آ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ابھی اس نے گلی پار نہیں کی ہوگی کہ منٹو پھر سے آ نکلا۔ بولا ''میں نے شباب کیرانوی کو تمہارے ہاں سے نکلتے دیکھا ہے۔ سوچا اس کا تم سے کیا

کام---- سوائے اس کے کہ اپنے رسالے کے لیے تم سے کچھ مانگے۔ وہ تمہیں کچھ معاوضہ دے گیا ہوگا۔'' میں نے کہا ''آپ ٹھیک سمجھے۔ یہ پچیس روپے جو میز پر رکھے ہیں، وہی دے گیا ہے۔ یہ آپ لے جایئے۔'' منٹو بولا ''نہیں سب نہیں، مجھے صرف پندرہ روپے درکار ہیں۔ باقی دس تمہارے کام آئیں گے۔'' تب منٹو نے پندرہ روپے اٹھا لیے اور چلا گیا۔ مجھے بڑی تسکین محسوس ہوئی کہ خدا نے ایک عزیز دوست کی ایک مشکل میرے توسط سے آسان کر دی۔

اُس روز ہمارے محلے میں ایک شادی تھی۔ شادی والے گھرانے سے منٹو کے بھی تعلقات تھے اور دوسرے کئی ادیب بھی مدعو تھے۔ میں جب شادی والے گھر پہنچا تو بہت سے لوگ موجود تھے مگر وہاں مجھے کوئی ادیب نظر نہ آیا۔ معلوم ہوا ادیب آئے تو ہیں مگر اس وقت نسبت روڈ کے فلاں ڈاکٹر کے کلینک میں گپ شپ کے لیے جمع ہیں۔ میں پہنچا تو کلینک کا دروازہ بند تھا۔ دروازے کو ہاتھ لگایا تو کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ ادیبوں کے اس ہجوم میں منٹو سامنے میز پر بیئر کی بوتلیں رکھے پی رہا ہے۔ مجھے دیکھا تو میں نے زندگی میں پہلی بار اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور ندامت دیکھی۔ اس نے صرف اتنا کہا ''تم یہاں کیسے آ ٹپکے احمد ندیم قاسمی!'' میں نے جواب میں صرف مسکرا دینا بہتر سمجھا اور منٹو کے پاس بیٹھ گیا۔

حلقۂ اربابِ ذوق میں منٹو نے ایک افسانہ پڑھا جو اس کے اعلیٰ معیار سے خاصا ہٹا ہوا تھا اور مجھے کمزور محسوس ہوا۔ زندگی کے آخری دور میں، عجلت کی وجہ سے وہ اسی طرح کی کہانیاں لکھنے لگا تھا۔ اس پر تنقید کا سلسلہ جاری تھا جب منٹو بولا۔ ''یہ احمد ندیم قاسمی بھی میرے پاس بیٹھا ہے صدر صاحب! اس سے بھی تو افسانے کے بارے میں پوچھئے۔'' میں نے کہا ''یہ افسانہ منٹو کے اسلوب کی کامیاب نمائندگی کرتا ہے۔ وہی سلاست ہے وہی روانی ہے، وہی غیرضروری

عبارت آرائی سے انحراف ہے۔ البتہ منٹو نے جس طرح افسانے کو سمیٹا ہے اس سے مجھے امریکہ کا او ہنری یاد آ گیا ہے جو ہر افسانے کے آخر میں تھیلے سے بلی نکالتا ہے۔''

منٹو کچھ نہ بولا۔ جب اجلاس ختم ہوا تو وہ میری کلائی جکڑ کر ایک طرف لے گیا اور بولا ''ایسی باتیں جلسوں میں نہیں کی جاتی ہیں۔ اور اگر تمہیں افسانے کے تھیلے سے بلی نکلنے کی شکایت ہے تو میں تمہیں تھیلے سے بلا نکال کر بھی دکھا سکتا ہوں۔'' میں نے منٹو سے معذرت کی' اسے گلے لگایا اور اس کے گھر تک اسے چھوڑنے آیا' جہاں ایک پیشہ ور شراب نوش اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ بعد میں اس نے اس شراب نوش پر ایک چونکا دینے والی کہانی لکھی اور شراب نوش نے اس کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جب وہ کسی کردار میں اپنی کوئی کہانی چھپی ہوئی دیکھتا ہے تو اس کے ساتھ تعلقات بڑھاتا ہے اور جب وہ اس کے شب و روز سے اچھی طرح باخبر ہو جاتا ہے تو اس کردار کے گرد اپنا افسانہ تعمیر کر لیتا ہے۔ پھر اگر اس کردار کو علم ہو جائے کہ منٹو نے اسے موضوع بنایا ہے تو منٹو اس سے یا وہ منٹو سے تعلقات منقطع کر لیتا ہے۔

ایک ایسا ہی کردار ایک معروف سیاسی شخصیت (خان) کا تھا۔ منٹو نے اس کے ساتھ چند دن گزارے اور پھر اس پر افسانہ لکھ ڈالا۔ یہ افسانہ شائع ہوا تو وہ خان میرے پاس غصے سے بھرا ہوا آیا۔ میں اس زمانے میں روزنامہ ''امروز'' کا مدیر تھا۔ اس نے پوچھا ''منٹو آپ کا دوست ہے؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولا ''اس نے ہمارے خلاف افسانہ لکھا ہے۔ ہم اس کے دانت توڑ دے گا۔ وہ رہتا کدھر ہے؟'' میں نے محض اس لیے بے خبری کا اظہار کیا کہ خان صاحب بہت تاؤ میں تھے اور قبل اس کے کہ وہ منٹو تک پہنچیں' میں منٹو کو

خبردار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ آج کل ہماری بول چال بند ہے اور سنا ہے اس نے مکان بھی بدل لیا ہے۔ خان صاحب طیش میں اٹھ کر چلے گئے۔ میں نے منٹو کے پاس جانے سے پہلے ایک مختصری سٹاف میٹنگ بلائی۔ میٹنگ ختم ہوئی تو میں اِدھر جانے کے لیے اٹھا' اُدھر وہی خان صاحب مسکراتے ہوئے میرے دفتر میں داخل ہوئے۔ بولے ''وہ آپ کا یار منٹو ہم کو مل گیا تھا۔ ہم ظہیر کاشمیری سے اس کا پتہ پوچھنے جا رہا تھا کہ منٹو ہی بیڈن روڈ پر مل گیا۔ ہم نے کہا ''اِدر آؤ' تم نے ہمارے خلاف افسانہ لکھا۔'' منٹو بولا ''آپ کے خلاف نہیں لکھا آپ کے بارے میں لکھا ہے۔'' میں نے کہا ''کیا لکھا ہے؟'' وہ بولا ''یہی لکھا ہے کہ خان شراب پیتا ہے اور رنڈی بازی کرتا ہے۔'' میں نے گھبرا کر پوچھا ''پھر؟'' خان صاحب بولے ''پھر کیا' وہ تو اس نے ٹیک (ٹھیک) لکھا ہے نا----''

منٹو ایک روز ''امروز'' کے دفتر میں آیا اور بولا ''میں نے زندگی میں پہلی بار پنجابی زبان میں کہانی لکھی ہے۔ تم اپنے اخبار میں پنجابی صفحہ چھاپتے ہو اس لیے یہ کہانی اس میں درج کر دو۔'' میں نے نہایت مسرت کا اظہار کیا اور مسودہ اس سے لے لیا۔ پنسل سے لکھا ہوا یہ افسانہ میں نے پڑھا تو اس میں منٹو مجھے فن کے اس اوج پر نظر آیا جس پر وہ برسوں پہلے پہنچ چکا تھا۔ میں نے دفتر سے اسے افسانے کا پیشگی معاوضہ دلوا دیا اور پروگرام یہ بنایا کہ یہ افسانہ چھاپنے سے پہلے ''پنجابی زبان میں منٹو کی پہلی کہانی'' کے عنوان سے اس کی خوب تشہیر کروں گا۔ مگر چند روز بعد ہی پولیس میرے دفتر کی تلاشی لینے آ دھمکی اور اس نے مسودات اتنی بے رحمی سے الٹے پلٹے کہ منٹو کی کہانی کہیں غائب ہوگئی۔ میں جب تک ''امروز'' میں رہا' پرانی فائلوں میں اسے تلاش کرتا رہا مگر وہ شاید پولیس کے ہتھے چڑھ کر پار ہوگئی تھی!

آخری دنوں میں وہ ''ناخن کا قرض'' کے عنوان سے اپنے فن کے بارے میں معروف اہلِ فن سے ان کے تاثرات جمع کرتا پھر رہا تھا۔ میرے پاس آیا تو ایک کاغذ میرے سامنے رکھ دیا اور بولا ''میرے متعلق جو کچھ بھی تمہارے ذہن میں فوری طور پر خیال آئے وہ یہاں لکھ دو۔'' میں نے کہا ''میں منٹو کی سی بڑی اور محبوب شخصیت کے بارے میں لکھوں گا تو سوچ سمجھ کر لکھوں گا۔'' اسے غصہ آ گیا ''عجیب فراڈ ہو۔ میں عبدالرحمٰن چغتائی اور ملکہ پکھراج اور امتیاز علی تاج سے ان کا فوری تاثر لکھوا کر لا رہا ہوں اور تم ایک دم آسمان پر جا بیٹھے ہو'' میں نے کہا ''منٹو صاحب! میرا تاثر آج شام تک آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔'' مان گیا۔ بولا ''شام تک نہ پہنچا تو مجھ سے بڑا کوئی نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا ''پہلے آپ تھوڑے سے بڑے تو بنئے۔ پھر بڑائی کا کپیٹشن کرایئے گا۔'' وہ مسکرایا اور چلا گیا۔ شام سے پہلے میں نے اس کے ہاں اپنا تاثر پہنچا دیا۔ میں نے لکھا کہ میں منٹو کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بلا کا ضدی ہے۔ اگر حکومت اس کے افسانے ''نیا قانون'' کے خلاف مقدمہ چلاتی تو وہ حکومت کو تنگ کرنے کے لیے ''نیا قانون'' سے بھی بڑے افسانے لکھتا۔ مگر کوتاہ اندیش حکومت نے اس کے افسانوں ''کالی شلوار'' اور ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''دھواں'' کے خلاف کیس چلائے اور منٹو نے ضد میں آ کر ایک سے ایک جنسی افسانے لکھے اور یوں منٹو کی ہمہ جہتی اور اس کے ہاں موضوعات کے تنوع کو نقصان پہنچا۔ منٹو کے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ بتاتے ہیں کہ جب اسے میرا لفافہ ملا تو اس نے جیسے نفرت سے اسے ایک طرف پھینک دیا۔ گھنٹہ بھر بعد اٹھا۔ ٹہلتا ہوا فرش پر پڑے لفافے کے پاس آیا۔ اسے اٹھایا' کھولا' پڑھا اور کمال آسودگی سے بولا ''یہ میرا یار احمد ندیم قاسمی نہ جانے کیا چیز ہے' میری سمجھ میں تو آتا نہیں'' اور اس نے میرا تاثر تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے میرا تاثر قبول کر لیا ہے۔

آخر آخر میں ایک روز ایک ناشر کے ہمراہ وہ میرے پاس آیا۔ ناشر سے کہا کہ بوتل تھیلے سے نکال کر میز پر رکھ دو۔ اس نے وہسکی کی بھری ہوئی بوتل میز پر رکھی تو منٹو مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''اٹھیئے احمد ندیم قاسمی صاحب! اس کمرے کی گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیجئے اور مجھے ایک گلاس اور ایک جگ میں پانی لا دیجئے۔ آج میں یہیں پیوں گا اور آپ کے پورے محلے میں شراب کی بو پھیلاؤں گا۔''

میں نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ اوپر سے گلاس اور جگ لے آیا اور بولا ''بسم اللہ کیجئے۔'' اس نے حیرت سے مجھے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے دیکھا جو صحت کی کمزوری کی وجہ سے کچھ اور موٹی لگ رہی تھیں۔ پھر اس نے ناشر کو رخصت کر دیا اور ایسی آواز میں بولا جیسے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے ''میں تمہیں نہیں سمجھ سکا۔ تم مجھے نہیں سمجھ سکے۔ پھر ہم آپس میں دوست کیوں ہیں۔''

اُس روز میں نے پہلی بار دیکھا کہ منٹو کا شیو بڑھا ہوا ہے اور اس کے پاجامے کی کریز بھی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ میں نے کہا ''پیجئے۔ میں بوتل کھولوں؟'' منٹو ہنسا ''تم کیا خاک بوتل کھولو گے۔ تم کھولو گے تو کھلنے کے اس دھماکے کو سارا محلّہ سنے گا۔'' پھر وہ کھڑا ہوا۔ بولا ''چلو آؤ میرے ساتھ' بوتل کوٹ کے اندر چھپا لو۔'' میں بوتل چھپا کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ رستے میں وہ بولا ''یہ جو تم ترقی پسندوں کے لیڈر بنے پھرتے ہو نا' ان میں سے اگر کسی کو بھی معلوم ہو جائے کہ اس وقت منٹو کے پاس وہسکی کی پوری بوتل ہے اور وہ پینے جا رہا ہے تو وہ بھکاریوں کی طرح میرا پیچھا کریں گے۔'' میں خاموش رہا۔

گھر پہنچ کر اس نے بوتل مرکزی تپائی پر رکھی اور اندر پانی لینے چلا گیا۔ تب صفیہ بہن چند سیکنڈ کے لیے آئیں اور مجھ سے کہا ''ندیم بھائی! خدا کے

انہیں خود کشی کرنے سے روک لیجئے۔ دنیا میں صرف آپ ہی انہیں روک سکتے ہیں۔ وہ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ وہ یونہی پیتے رہے تو بہت دن تک جی نہیں سکیں گے۔" منٹو آیا تو بولا "یہ کیا بہن بھائی میں کھسر پھسر ہو رہی ہے؟" صفیہ اندر چلی گئیں اور منٹو نے بوتل کھول کر شراب گلاس میں انڈیلنا چاہی تو میں نے صفیہ بہن کے ارشاد کے مطابق منٹو کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اسے اس کی بیوی اور بیٹیوں کا واسطہ دیا۔ اس کی اندھا دھند شراب نوشی کے بارے میں جو باتیں ہر جگہ ہوتی تھیں ان میں سے دو ایک کو دہرایا اور آخر میں ہاتھ باندھ کر فریاد کی کہ "منٹو صاحب! دیکھئے چھوڑ دیجئے اس مصیبت کو۔ چھوڑ نہیں سکتے تو کم کر دیجئے مگر خدا کے لیے اپنے اوپر اور اپنے متعلقین پر اور اپنے پیار کرنے والوں پر رحم کیجئے۔"

منٹو اس دوران میں دو تین پیگ چڑھا چکا تھا۔ اس کا رنگ بالکل مٹی ہو رہا تھا۔ وہ بولا "دیکھو احمد ندیم قاسمی! میں نے تمہیں دوست بنایا ہے۔ اپنے ضمیر کی مسجد کا امام مقرر نہیں کیا۔ مجھے وعظ نہ دیا کرو، سمجھے؟"

میں نے بے بسی سے اس طرف دیکھا جہاں صفیہ بہن پردے کے پیچھے میری باتیں سن رہی تھیں۔ میں کچھ دیر کے بعد وہاں سے اٹھ آیا اور پھر چند روز بعد میں منٹو سے محبت کرنے والے دوسرے دوستوں کے ہمراہ منٹو کا جنازہ اٹھائے جا رہا تھا۔

اور اب (۱) منٹو کے فن کے بارے میں چند مختصر باتیں اور ''سنگِ میل'' میں شائع ہونے والا منٹو کے نام میرا کھلا خط

(۱)

انسانیت کے بارے میں منٹو کا تصور بیشتر رومانٹک ہے مگر رومانٹک ہونا کوئی گناہ نہیں۔ یہ درست ہے کہ ان ادیبوں کا نقطۂ نظر بھی رومانٹک ہو سکتا ہے جن میں خوداعتمادی کی کمی ہوتی ہے یا جو تغیر اور ارتقا کے سلسلے میں بداعتمادی یا بے اعتمادی کے شکار ہوتے ہیں مگر منٹو اس معاملے میں عالمی ادب کی کئی بڑی بڑی شخصیتوں کی طرح صرف اس لیے رومانٹک ہے کہ وہ آرزو کر سکتا ہے۔

آرزو مروجہ حالات میں پسندیدہ تبدیلی کی خواہش کا دوسرا نام ہے اور اگر کسی ادیب سے یہ آرزو بھی چھن جائے تو وہ خواب دیکھنے پر بھی قادر نہیں رہتا۔ وہ صرف دو جمع دو مساوی چار کے فارمولے پر عمل کرتا رہ جاتا ہے اور اس کے ہاں حقیقت اور فنی حقیقت کے درمیان امتیاز کی حس شل ہو جاتی ہے۔

منٹو کے ہاں تغیر اور تبدیلی کا کوئی بڑا فلسفہ نہ سہی مگر اس میں آخری دم تک آرزو کرنے کی سکت باقی رہتی ہے اور اپنے ذہن میں آرزو کی قندیل کو ایسے حالات میں بھی روشن رکھنا' جب بحیثیتِ مجموعی معاشرے کا خون صرف سفید ہی نہیں سیاہ ہو چکا ہے' کوئی معمولی کارنامہ نہیں' ہے۔

منٹو نے معاشرے کے جن افراد کو اپنے افسانوں کا ہیرو بنایا ہے وہ بیشتر ایسے لوگ ہیں جنہیں معاشرہ' سماجی اور اخلاقی لحاظ سے رَد کرتا ہے۔ بھوک اور احتیاج نے ان کی انسانیت کو چاٹ لیا ہے اور انسانیت کے معیاروں کے اس المیے کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی روحیں بھی سنسان ہیں۔ اس کے باوجود یہ غنڈے' یہ بدمعاش' یہ جیب کترے' یہ طوائفیں' یہ دلاّل' انسانی فطرت کی بنیادی نیکی سے دامن نہیں چھڑا سکے۔ اسی لیے یہ بدکار لوگ اپنی بدکاری ہی کے عمل میں' نیکوکاری

کے وہ کارنامے انجام دے جاتے ہیں، جنہیں قریب قریب ہر ملک اور ہر ملت کا علم اخلاق ہمدردی، ایثار اور قربانی کا نام دیتا ہے۔ انسانیت کے معیاروں کی راکھ میں اس چنگاری کا سراغ لگا کر منٹو نے دراصل یہ آرزو کی ہے کہ یہ چنگاری بھڑک کر شعلہ بن جائے۔ اگر منٹو کے ہاں یہ آرزو نہیں ہے، جیسا کہ منٹو کے بعض نقاد گذشتہ کئی برس سے ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں، تو پھر اس کے ہاں خوشیا اور بابو گوپی ناتھ اور موزیل اور سوگندھی ہی کیوں ہیں؟ جب وہ اس قسم کے کرداروں کی بدکرداری کی کہانی سناتا ہے تو آخر میں اس کی نظریں بداخلاقی کے اس ملبے میں اخلاق کے اس چمکتے ہوئے ذرے پر کیوں جم جاتی ہیں جس کا وجود ان کی پوری کی پوری منفی شخصیت کا اثبات کر دیتا ہے۔

ٹیکنیک کے لحاظ سے منٹو بہت محتاط افسانہ نگار ہے۔ وہ معمولی الفاظ سے غیر معمولی مفہوم کا کام لینے والا ادیب ہے۔ چنانچہ اس نے محض اکا دکا افسانوں ہی میں خطابت کی ہے۔ خطابت کے ان ٹکڑوں میں اس نے اپنے کرداروں کی بدی میں خیر کے اس شائبے کی دریافت کا واضح طور پر ذکر کیا ہے مگر وہ عموماً ایسا نہیں کرتا۔ اس کے افسانوں میں یہ دریافت، یا یہ بازیافت سیدھے سادے لفظوں میں، سلیس عبارت میں، مکالموں کے بے ساختہ جملوں میں کہیں بین السطور پوشیدہ رہتی ہے۔ منٹو کا فنی کمال یہ ہے کہ اس کا قاری اس کے بالواسطہ اظہار کے باوجود اس دریافت سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ منٹو کے افسانوں کا محور ہی یہ دریافت ہے۔ اسی کی روح شروع سے آخر تک افسانے میں جاری و ساری رہتی ہے اور جب قاری افسانہ پڑھ لیتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ منٹو نے جن کرداروں کو (خود اس کے اپنے اعتراف کے مطابق) بظاہر ننگا کیا، وہ تو اپنے اندر کسی نہ کسی نیکی کا چراغ جلائے بیٹھے ہیں، اور ننگی تو معاشرے کی وہ قوتیں ہوئی ہیں جنہوں نے ان کرداروں کو ان کے افلاس اور احتیاج کے

جرمانے میں ننگا کرنے کی کوشش کی۔

معاشرے کی یہی قوتیں، افراد کی حیثیت اختیار کر کے، منٹو کی کہانیوں کے ویلین بن جاتی ہیں۔ یہ بظاہر بڑے مقطع چھطع لوگ ہوتے ہیں۔ انہوں نے تقدیس اور وقار کے لبادے اوڑھ رکھے ہوتے ہیں۔ روحانی اور اخلاقی عظمت کی قبائیں ان کے زیبِ تن ہوتی ہیں، مگر جب منٹو ان لبادوں کو نوچتا اور قباؤں کو اتارتا ہے، تو نیچے سے ایسے ایسے غنڈے، ایسے ایسے بدمعاش برآمد ہوتے ہیں کہ پورا معیشی، معاشرتی اور اخلاقی ڈھانچہ بے معنی، بے کار اور بودا معلوم ہونے لگتا ہے۔ یوں منٹو اپنی اس آرزو کا اظہار کرتا ہے کہ انسان کے اندر خیر کی قوت کبھی مردہ نہ ہونے پائے، اور معاشرے کی جو سفاک قوتیں، خیر کی اس فطری حس کو مفلوج کرنے میں کوشاں ہیں، انہیں مزید پنپنے سے روکا جائے۔

منٹو کے ہاں آج کل بہت کچھ دریافت کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ کوئی منٹو کو فرائڈ کی رو سے دیکھتا ہے اور کوئی ژونگ کے حوالے سے اس پر گفتگو کر رہا ہے۔ کسی کو منٹو میں سمرسٹ ماہم نظر آتا ہے تو کسی کو ڈی۔ایچ۔ لارنس۔ کوئی منٹو کو یوں داد دیتا ہے کہ اس نے اخلاقی اور قانونی ضابطوں سے بے نیاز ہو کر کتنی بے خوفی سے عریاں نویسی کی۔ کسی کا ارشاد یہ ہے کہ منٹو نے جنس کے موضوع پر سپیشلائز کر کے بڑی دانائی اور دوراندیشی کا ثبوت دیا۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ جب تک ان حضرات کو منٹو کے افسانوں میں پھیلی ہوئی بداخلاقی کی دھند میں اخلاق کا وہ چمکتا ہوا تارا نظر نہیں آئے گا جس کی دریافت نے منٹو کو بڑا اور سچا اور نڈر افسانہ نگار بنایا، اُس وقت تک منٹو کے فن کے جائزے اور اس کے کرداروں کے تجزیے ادھورے رہیں گے۔

(۲)

لاہور

۱۵ ستمبر ۱۹۴۸ء

پیارے سعادت!

جب میں نے دو ماہی ''اردو ادب'' کے اجرا کے متعلق سنا' اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ ادارے میں آپ اور محمد حسن عسکری شامل ہیں تو متعدد احباب کو میں نے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ ''آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔'' اور جب احباب نے تفصیل پوچھی تو میں نے کہا ''اردو کے تمام زندہ افسانہ نگاروں میں منٹو کی فنی اور شخصی انفرادیت نمایاں ترین ہے۔ اس کی شخصیت کا کسی دوسرے پیکر میں مدغم ہونا غیر ممکن ہے اور اس کے فنی نظریات کچھ ایسے کٹیلے اور جاندار ہیں کہ محمد حسن عسکری کی ماورائیت انہیں ہضم کرنے کے لیے ترقی پسندی ہی کا چورن استعمال کرنے پر مجبور ہو جائے گی'' ---- معترضین میں سے چند ایک تو مجھ سے متفق ہوگئے اور باقیوں نے میرے اس اعلان کی تائید کو ''اردو ادب'' کے پہلے شمارے کی اشاعت تک ملتوی کر دیا۔ دراصل میں تو آگ اور پانی کے اس اشتراک کو نئے ادب کے لیے نیک فال سمجھتا تھا' اور مجھے یقین تھا کہ محمد حسن عسکری' جن کی ذہانت کا میں معترف ہوں اور جن کے تنقیدی انداز بیان میں فراق اور سید احتشام حسین کا سا رچاؤ اور نکھار ہے' جب آپ کے قریب ہوں گے تو آپ کی خوفناک صاف گوئی اور آپ کے ادبی نظریات کی شدید ہمہ گیری سے متاثر ہو کر اچانک ادیب کی فنی اور سماجی حیثیت کی اکائی کے قائل ہو جائیں گے۔ اور ترقی پسند ادیبوں کو بااین سنجیدگی و وضعداری' برا بھلا کہنے' ان کا مضحکہ اڑانے اور ان کو کمیونزم کے غیرادبی پرچارک کی ''گالی'' دینے سے باز آ جائیں گے۔ میں نے اس یقین کا اعلان کئی ادبی شخصیتوں کے سامنے کیا اور اس لیے

''اُردو ادب' کے لیے میں نے ایک نظم بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دی۔

یکم اگست ۱۹۴۸ء کو ہاجرہ بہن کے نام آپ کا ایک خط آیا۔ آپ نے ان سے ''اُردو ادب'' کے لیے ان کی ''نگارشات'' طلب کی تھیں۔ اس خط پر آپ کے علاوہ محمد حسن عسکری کے دستخط تھے۔ میں نے اس خط کو نہایت شوق سے پڑھنا شروع کیا کیونکہ اس میں ''اُردو ادب'' کی پالیسی کے اعلان کی توقع تھی۔ ہاجرہ بہن سے میں نے شرط بھی بد لی۔ وہ کہتی تھیں کہ محمد حسن عسکری کی مبہم کونین کی شکر چڑھی گولی کے مترادف ہے اور منٹو ایسا سخت گیر انسان بھی اس کا فریب کھا سکتا ہے۔ مجھے ان سے اتفاق نہ تھا لیکن پہلی ہی سطر میں یہ پڑھ کر کہ ''یہ رسالہ کسی مخصوص مدرسہ فکر کا پابند نہیں'' میں چونکا۔ میں شرط ہار گیا تھا۔ میری بہن کو شرط جیت لینے کی کوئی خوشی نہ تھی' بلکہ وہ نہایت اُداس ہو کر بولیں ''یہ تو عسکری صاحب بول رہے ہیں۔'' اور میں نے اپنے غیر متزلزل یقین کے سہارے کہا ''آگے چل کر منٹو بھی کوئی بات کہے گا اور ہمیشہ کی طرح کوئی ایسی بات اور کچھ اس انداز سے کہے گا کہ عسکری کی آواز دب جائے گی''---- میں خط پڑھتا گیا اور میری آواز مدھم ہوتی گئی اور جب میں خط ختم کر چکا تو مجھے احساس ہوا کہ آج میں ایک بہت بڑی ذہنی شکست سے دوچار ہوا ہوں۔ بحیثیت انسان آپ ہمیشہ مجھے بہت عزیز رہے ہیں لیکن میری نظروں میں بحیثیت ادیب بھی آپ کی وقعت کچھ کم نہیں اور شاید آپ پہلے ادیب ہیں' جن کی زندگی اور آرٹ میں نہایت خوشگوار تعاون کارفرما ہے---- میں دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا اور سوچتا رہا---- کاش اس خط پر آپ کے دستخط نہ ہوتے! کاش آپ نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہوتا! کاش آپ دستخط کرنا بھول گئے ہوتے! کاش آپ کی انفرادیت یوں بے خبری میں کچلی نہ جاتی! اور کاش آپ سوچتے کہ آپ نے ہوش میں لانے والا انجکشن دینے کے بجائے ایک نیند آور دوا کے نسخے پر دستخط

ثبت کر دیے ہیں! اور منٹو جس کو صدیوں تک زندہ رہنا ہے' پیچھے ہٹ گیا ہے اور عسکری (کاش عسکری نے فرانسیسی زبان نہ پڑھی ہوتی) جس کی ذہانت اندھا دھند مطالعے کے صحراؤں میں بھٹک چکی ہے' اس شان سے ابھرا ہے کہ منٹو کے خط و خال صرف غیرنمایاں ہی نہیں' بگڑے بگڑے سے بھی ہیں۔

صدمہ اس بات کا نہیں کہ آپ نے جدید ادب کو ایک ''ایت'' قرار دے کر اسے ''غوغائے محض'' کے نام سے پکارا ہے' دکھ اس بات کا ہے کہ سالنامہ 'ادبِ لطیف' ۱۹۴۴ء میں (جسے میں نے ہی مرتب کیا تھا) آپ کا ایک مضمون ''ادبِ جدید'' کے عنوان سے چھپا تھا جس میں آپ نے لکھا تھا ''وہ وقت بھی آ جائے گا جب اس جدید ادب کا صحیح مطلب واضح ہو جائے گا۔'' اور اس جدید ادب کو آپ نے ایک عام مروجہ اصطلاح کی صورت میں استعمال نہیں کیا تھا بلکہ اس کو اپنے آپ میں مجسم پایا تھا اور لکھا تھا:

''بعض لوگ ادب جدید المعروف نئے ادب یعنی ترقی پسند ادب کو سعادت حسن منٹو بھی کہتے ہیں اور جنہیں صنفِ کرخت پسند نہیں وہ اسے عصمت چغتائی کہہ لیتے ہیں''۔

اور اس مضمون میں آپ نے اعلان کیا تھا کہ آپ اس ''ایت'' کو ختم نہیں ہونے دیں گے' بلکہ آپ نے لوگوں کو مشورہ دیا تھا کہ پہلے اس ماحول' اُن حالات کا خاتمہ کیا جائے جنہوں نے آپ کو یہ ''ایت'' اختیار کرنے پر مجبور کر رکھا تھا۔۔۔۔

''وہ لوگ جو ادبِ جدید کا۔۔۔۔ ترقی پسند ادب کا۔۔۔۔ فحش ادب کا' جو کچھ بھی یہ ہے' خاتمہ کر دینا چاہتے ہوں تو صحیح راستہ یہ ہے کہ ان حالات کا خاتمہ کیا جائے جو اس ادب کے محرک ہیں۔''

مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا آج ان حالات کا حسن عسکری کے ڈیدی اور بودلیئری اور فلابیئری نظریات نے خاتمہ کر دیا ہے؟ کیا بقول آپ کے ''عورتوں اور مردوں کے درمیان جو موٹی دیوار'' حائل تھی وہ دیوار گر چکی ہے؟ وہ دیوار جس کے چونے کو عصمت چغتائی نے اپنے تیز ناخنوں سے کریدنے کا عزم کیا تھا کیا کشمیر کے حسین دیہات میں سے شہروں کی ''گندگی'' غائب ہو چکی ہے۔ جسے ہر طرف منتشر دیکھ کر ''غریب کرشن چندر ہولے ہولے رویا کرتا تھا؟''----- کیا انسانوں کی اور خاص طور پر سعادت حسن منٹو کی وہ ''کمزوریاں'' دور ہو چکی ہیں جنھیں آپ نے خوردبین سے دیکھ دیکھ کر باہر نکالنے اور دوسروں کو دکھاتے رہنے'' کا تہیہ کیا تھا؟---- اگر سماج کی یہ سب شکایتیں ختم ہو چکی ہیں تو ترقی پسند ادب کو خوشی سے خیرباد کہہ لیجئے، لیکن اگر عورت اور مرد کے درمیان جو موٹی دیوار حائل تھی وہ اور اونچی اور موٹی ہوگئی ہے، اور اگر اب ہمارے دیہات میں شہروں کی گندگی کے ڈھیروں کی بجائے پہاڑ ابھر آئے ہیں اور ہواؤں تک میں تعفن بس چلا ہے، اور اگر انسان اب سراسر کمزوری بن کر رہ گیا ہے تو میرے بھائی، یہ ''ایت'' اُسی طرح قائم ہے اور عصمت، کرشن، بیدی اور منٹو کے فرائض ابھی ختم نہیں ہوئے اور محمد حسن عسکری کی عبارت پر ابھی آپ کے دستخط بھلے معلوم نہیں ہوتے۔

میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ مسلمان کہا ہے۔ میں کمیونسٹ بھی نہیں ہوں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا باقاعدہ ممبر بھی نہیں ہوں۔ کشمیر پر ہندوستانی فوجوں کی چڑھائی کو استبدادی اقدام سمجھتا ہوں۔ سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین میں ہر سیاسی خیال کے ادیب کی شمولیت کا ذکر کرتے ہوئے فیض احمد فیض کو اور مجھے لیگی قرار دے چکے ہیں۔ میں اپنے وطن کا وفادار ہوں۔ پاکستان ہماری رگِ جان ہے مگر میں محمد حسن عسکری کے ادبی نظریات سے متفق نہیں ہو سکتا۔ اس لیے

کہ وہ جس ادب کو رواج دینا چاہتے ہیں وہ پاکستانی عوام کے ارتقا کا قاتل ہے۔ شاید آپ نے غور نہیں کیا کہ وہ ادب کو ایک ایسے طبقے کی جاگیر بنانے پر تلے ہوئے ہیں جس کو مارکسی اصطلاح میں بورژوا، اور عام طور پر درمیانہ طبقہ کہا جاتا ہے۔ اس خطرناک مہم کو سر کرنے کے لیے انہوں نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ کچھ ایسا ہے کہ عوام مذہب کا نام پڑھ کر چونک اٹھتے ہیں اور ان سے اونچا طبقہ مذہب کی اس دہائی کی تہہ میں اپنے مفاد کو پھولتا پھلتا دیکھ کر مسکراتا ہے اور محمد حسن عسکری اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ اس طرح قوم کی کوئی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں، یا اس گمان میں مگن رہتے ہیں کہ اس طرح انہوں نے ایک بہت بڑے ادبی مصلح کا تاج اپنے سر پر جما لیا ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ پاکستانیوں کے ذہنوں کو ہمیشہ کے لیے منفعل اور مضمحل رکھنے کی اس سے بڑی اور کوئی سازش نہیں ہو سکتی۔ محمد حسن عسکری کو شکایت ہے کہ ترقی پسند ادیب مسلم قوم کے وجود ہی کے قائل نہیں اور وہ اپنی نام نہاد" انسان پرستی کے جوش میں ہندو پاکستان کو پھر یک جا کر کے نہرو اور پٹیل کے قدموں میں ڈال دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس ضمن میں عموماً ہندوستان کے ترقی پسندوں کی تحریروں کے حوالے دیتے ہیں۔ شاید اب تک انہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان ایک قطعی الگ ادارہ ہے اور ہندوستان کی انجمن سے اس کا صرف اتنا تعلق ہے جتنا مشرق و مغرب کی تمام دوسری ترقی پسند انجمنوں سے۔ اتنا تعلق جتنا محمد حسن عسکری کو یا آپ کو یا مجھے کسی ہندوستانی دوست سے ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے ترقی پسند کشمیر، حیدر آباد، جونا گڑھ وغیرہ کے مسائل کو جس انداز سے پرکھیں ہمیں اس سے غرض نہیں۔ اس لیے کہ یہ ان کے اپنے وطن کے مسائل ہیں اور وہ انہیں اپنے ملک کی مصلحتوں کی روشنی میں سوچتے ہیں۔ ہم پاکستانی ہیں۔ ہماری مصلحتیں مختلف ہیں۔ ہم ان مسائل کے

بارے میں اپنے ملک کی بھلائی اور ترقی کی روشنی میں سوچتے ہیں۔ آپ کو ایک بھی ایسی مثال نہیں ملے گی جب پاکستان کے کسی ترقی پسند ادیب نے اپنی تحریر میں پاکستان سے غداری کا اعلان کیا ہو۔ پھر آپ کے شریک کار محمد حسن عسکری

بار بار یہ اعلان کرنے پر کیوں مجبور ہیں کہ ترقی پسند ادیب (جنہیں انہوں نے کپلنگ کی ''بندر لوگ'' کی اصطلاح کے مطابق ''ادیب لوگ'' کے نام سے محض اپنی ذہنی آسودگی کے لیے یاد فرمایا ہے) نوجوانوں اور طالب علموں کو ورغلا کر پاکستان کی جڑیں کھود رہے ہیں۔ دراصل ترقی پسند ادب ایک ہوّا بن کر حسن عسکری کی تمام نقادانہ قوتوں پر سوار ہو چکا ہے' ورنہ سعادت بھائی! کیا پاکستان کے عوام کو (جو ننانوے فی صد مسلمان ہیں) ان کا حق دلانا پاکستان سے غداری ہے؟ کیا فتنہ و فساد کے واقعات پر نفرین بھیج کر آئندہ کے لیے اس غیرانسانی مشغلے کی روک تھام پاکستان سے غداری ہے؟ کیا جاگیرداری اور سرمایہ داری کے اداروں کی بیخ کنی پاکستان سے غداری ہے؟---- اور کیا یہ غداری نہیں کہ ہندوستانی ترقی پسندوں کی تحریروں کا سہارا لے کر پاکستانی ترقی پسندوں کے خلاف زہر اگلا جائے؟ کیا یہ غداری نہیں کہ پاکستانی ادیب کے سامنے آندرے زید کی سی مثال رکھی جائے' اور انہیں بتایا جائے کہ وفاداری ملک سے نہیں حکومت سے وابستہ ہونی چاہیے؟ اور کیا یہ غداری کی انتہا نہیں کہ ہر نئے حاکم کو ملک کی حکومت سونپ دینے کے بعد اس کے حق میں قصیدہ خوانی کی ترغیب دی جائے؟

مصیبت یہ ہے کہ محمد حسن عسکری' ترقی پسند ادیبوں میں جن قوتوں کے فقدان کا ماتم کرتے ہیں انہی قوتوں کے فنی اظہار پر بوکھلا بھی جاتے ہیں۔ وہ ترقی پسندوں سے پوچھتے ہیں ''آپ کے دل میں اپنے عوام کا کتنا درد اور ان کی کتنی عزت ہے؟'' میرے خیال میں اس سوال کا صرف یہ جواب کافی ہے ''ہماری تحریک کی بنیاد ہی عوام کے درد کو اپنا درد سمجھنے اور ان کے احترام پر مبنی

ہے۔''---- وہ پوچھتے ہیں ''ان کے عزائم اور ان کے آدرشوں کی آپ کیا وقعت کرتے ہیں؟''---- جواب یہ ہے ''کہ ان کے عزائم اور آدرشوں کا تجزیہ ہی تو ارباب اختیار کو اور آپ کو آتش زیر پا کر دیتا ہے۔''---- ترقی پسند ادیب قوم سے حسن عسکری کی طرح بے تعلق نہیں، وہ پاکستان کے کروڑوں عوام کے سچے بہی خواہ اور مخلص ہمدرد ہیں۔ انہیں اس حقیقت کا احساس اور اعتراف ہے کہ پاکستان کے تحفظ اور عظمت ہی میں ہمارا تحفظ و عظمت پوشیدہ ہے اور حسن عسکری نے ان کے اس قصور کی بنا پر ان کی کتابوں کا الاؤ لگانے اور ان کو چو میخ کر کے چھوڑ دینے کے خواب دیکھے ہیں۔

اور پھر انسانیت پرستی کوئی ایسی لعنت تو نہیں کہ حسن عسکری اپنی ''جھلکیوں'' اور اپنی ''وفاداریوں'' میں اس سے بدک بدک اٹھے ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت میں انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ مسلمان سے بڑا انسانیت پرست اور کون ہوگا؟ انسانیت پرستی ہمیں یقیناً اپنے وطن سے غداری کرنا نہیں سکھاتی۔ دراصل جب بھی کوئی ادیب طبقاتی تقسیم، جاگیرداری، زمینداری اور سرمایہ داری کے خاتمے اور انسان پرستی کا ذکر کرتا ہے، ایک محمد حسن عسکری ہی نہیں (کہ ان کی تو یہ عادت ہو چکی ہے) ہر وہ انسان جس کا مفاد ان غیر انسانی اداروں سے وابستہ ہے، چونک اٹھتا ہے، اور اسے سچا مسلمان کہنے کے بجائے ''اشتراکی'' کی گالی داغ دیتا ہے۔ اور جب حسن عسکری ترقی پسندوں کو روس کے ایجنٹ ثابت کرنے بیٹھتے ہیں تو سجاد ظہیر اور احتشام حسین کے علاوہ فیض، خدیجہ، ہاجرہ یا آپ کا اور میرا نام کیوں نہیں لیتے؟

لیکن آپ کا تو انہوں نے گذشتہ دنوں بڑے پیارے انداز میں ذکر کیا ہے۔ وہ ''امروز'' ۱۵۔ اگست ۱۹۴۸ء میں لکھتے ہیں (آپ نے اسے صرف پڑھا ہی نہیں ہوگا بلکہ سنا بھی ہوگا)۔

''منٹو کے افسانوں میں پہلے مجھے کوئی گہری دلچسپی نہیں تھی مگر
اب جب وقت نے کھرا کھوٹا الگ کرنا شروع کر دیا[1]
ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ نئے افسانہ نگاروں میں منٹو ہی ایک
ایسا آدمی تھا جسے براہِ راست انسانی دماغ اور اس کی کیفیات
سے دلچسپی تھی----''

''کیوں صاحب آج سے پہلے جب آپ اُردو افسانے کی دنیا کو خالی ڈھنڈار سمجھتے تھے، اُن دنوں بھی تو منٹو کے وہی مجموعے بازاروں میں بکتے تھے جو آج بک رہے ہیں اور ۱۵۔ اگست ۱۹۴۸ء تک وہی بک رہے تھے۔ اُس روز تک منٹو کے افسانوں کا کوئی نیا مجموعہ نہیں آیا تھا لیکن اچانک آپ کو منٹو سے یہ گہری دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی؟''----حسن عسکری سے کبھی یہ سوال پوچھا آپ نے؟

یقیناً نہیں پوچھا ہوگا۔ اب بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ جواب میں عرض کیئے دیتا ہوں۔ تنقید کی چٹان سے اچانک منٹو کے فنی کمالات کا جو فوارہ بلند ہوا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ محمد حسن عسکری کو آپ سے ایک ضروری کام ہے اور وہ ہے ترقی پسندوں کی صفوں میں انتشار۔

وہ اس انتشار کے اس قدر خواہشمند کیوں ہیں؟ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ تقسیم ہند سے پہلے ان کے سیاسی نظریات کمیونسٹ ادیبوں سے مختلف رہے ہیں، اور وہ اب تک ان کا ڈھنڈورا پیٹتے چلے آ رہے ہیں۔ سیاسی نظریات کے اختلاف پر صحت مند بحث و تمحیص نہایت مفید رہتی ہے لیکن ادب کو خالص سیاسی یا ذاتی دشمنیوں کے چنگل میں گھسیٹنے اور رگیدنے کا مقصد؟----

---

۱۔ یعنی جب سے ''اردو ادب'' کا ڈیکلریشن حاصل کرنے کی درخواست لکھی گئی ہے۔

اس طرح محمد حسن عسکری پاکستان سے دشمنی کر رہے ہیں اور پاکستانی ادیب کی صفوں کو منتشر کرنے کا مرتکب ہونا چاہتے ہیں۔ وہ ''اتحاد اتحاد'' ضرور پکارتے ہیں، لیکن اتحاد ہی کا نعرہ تو ہٹلر نے بھی بلند کیا اور برطانوی شہنشاہیت نے بھی اور امریکی سرمایہ داروں نے بھی اور روسی جمہوریت نے بھی ---- قول و عمل کا اتحاد ہی سب سے موثر حربہ ہے لیکن یہاں یہ عالم ہے کہ ''امروز'' میں اتحاد کا نعرہ بلند ہو رہا ہے اور ''ساقی'' میں وہ وہ دشنام دیے جا رہے ہیں کہ ان میں ''نزاکت آواز'' کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ذرا سوچیے اور ساتھ ہی محسوس بھی کیجئے بھائی کہ آپ تو بے حد حساس ہیں۔

ایک اور بات خاص طور پر قابل غور ہے۔ محمد حسن عسکری نے ترقی پسند ادیبوں کی زبان بندی کے ضمن میں ''نظام'' اور دوسرے اخبارات و رسائل کے کافی کالم سیاہ کئے ہیں۔ ''سول ملٹری گزٹ'' کے ''ڈاکٹر حجازی'' کا انداز بھی یہی رہا ہے لیکن جب ان کی تمنا میں پوری ہوئیں اور ''نقوش''، ''سویرا'' اور ''ادب لطیف'' کو ایک نہ دو پورے چھ مہینوں کے لیے بند کر دیا گیا تو پاکستان ٹائمز میں سب سے پہلے جس شخص نے حکومت کے طرز عمل پر احتجاج کیا وہ محمد حسن عسکری ہی تھے۔ جن نظموں، افسانوں اور مضامین کو پڑھ کر ان کی تنقیدی رگیں ایک برس تک جھنجھناتی رہیں وہ کیا ''مست قلندر'' اور ''حسن پرست'' وغیرہ میں چھپتے تھے؟ انھی رسالوں کی زبان بندی ہی کے لیے تو حسن عسکری نے دنوں کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دی۔ اور زبان بندی کے فوراً بعد انھی رسالوں کی پشت پناہی کے لیے اس زور سے اٹھے، یہ بھی ایک مصلحت کا کرشمہ ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس سے حسن عسکری کی رہنمایانہ امنگوں اور ادبی شہنشاہیت کی آرزوؤں کا سراغ ملتا ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھانا اسی کا نام ہے۔ مبتدی اور معصوم قسم کے ادیبوں کے ذہنوں کو یوں گرفت میں لیا جاتا ہے۔ عقب سے آ کر چھرا گھونپنا اسے کہتے

ہیں۔ اور سعادت بھائی! اگر ''کھول دو'' درمیان میں حائل نہ ہوتا تو حسن عسکری حکومت کے اس اقدام کو سراہتے نہ تھکتے۔ مگر مصیبت یہ آن پڑی کہ منٹو بھی ماخوذ تھا اور اسی لیے خود عسکری کا مفاد الجھ گیا تھا۔ کوئی پوچھے کہ عسکری صاحب! یہ فقرہ آپ نے کس کی خاطر لکھا تھا کہ قوم کو ادب اور ادیبوں سے پانچویں کالم کی طرح نمٹنا پڑے گا؟ اب ''قوم'' ان سے نمٹی ہے تو آپ نے ان کے تحفظ کا علم کیوں بلند کر لیا؟ خلوت میں بیٹھ کر مسکرایئے اور کسی فاشسٹ فن کار کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کیجئے کہ جو کچھ ہوا خوب ہوا۔

دراصل تقسیم کے بعد ہمارے ہاں اچھے اور نامور فن کاروں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔ جو چند ایک ہیں ان میں آپ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اس بنا پر حسن عسکری کو اچانک آپ کی فنی عظمت کا شعور و الہام ہوا اور انہیں پتہ چلا کہ منٹو تو بہت اچھا افسانہ نگار ہے' اور آپ نے جانے یکایک کیسے مان لیا کہ حسن عسکری تو پاکستان کا بہت ہی بڑا نقاد ہے--- لطف یہ ہے کہ اس تعریف و توصیف کے عین وسط میں رسالہ ''اُردو ادب'' خیمہ زن ہے جس کو آپ دونوں مرتب کر رہے ہیں--- منٹو اور عسکری--- زندگی اور خوابیدگی--- آگ اور پانی!

بُرا نہ مانیے گا بھائی--- آپ حسن عسکری کو راہِ راست پر لانے نکلے تھے مگر ان کے فنی باغیچے میں مصنوعی پھولوں کی تزک بھڑک دیکھ کر اپنی راہ ہی سے دور ہٹے جا رہے ہیں۔ میں تو تصور تک نہیں کر سکتا کہ آپ کو بھی کسی دوسری شخصیت میں گھل مل کر غائب ہو جانا آتا ہے۔ مجھے حسن عسکری سے کوئی بیر نہیں۔ میرے دل میں ان کی سنجیدگی اور علمی قابلیت کی عزت ہے۔ چار پانچ برس تک ہمارے درمیان نہایت باقاعدہ خط و کتابت بھی رہی ہے اور ان میں ہم نے ایک دوسرے کو گالیاں نہیں دیں بلکہ علمی و ادبی بحثیں کی ہیں۔ وہ ترقی

پسندوں کی نظموں اور افسانوں کے منتخب مجموعے تیار کرنے کے بعد ان سے الگ ہو گئے ہیں (بڑا ہو فرانیسی زبان کا کہ یہ اسی کا کیا دھرا ہے)۔ وہ پھر سے ان کے قریب آ سکتے ہیں اور یہ آپ کا فرض ہے---- آپ جو ان دنوں ان کے ممدوح اور دوست ہیں' آپ ہی ان پر یہ حقیقت واضح کر سکتے ہیں کہ ''بھئی' اگر آپ کو تقسیم سے پہلے چند ترقی پسندوں سے شکایتیں رہیں تو وہ مُنّا آپ اب تک کیوں چلائے جا رہے ہیں۔ آپ ہر چیز کے پیچھے لٹھ لے کر کیوں پڑ جاتے ہیں۔ فراق کو آپ نے اُردو کا سب سے بڑا شاعر مانا ہے۔ مگر آپ کے ''اعتراضات'' کا یہی عالم رہا تو عنقریب آپ ہر اس شاعر کے نام کو ''انسانی دماغ اور اس کی کیفیات'' کا شاہکار کہنے لگیں گے جو رسالہ ''اُردو ادب'' کے ادارے میں شامل ہو جائے' یا جس کی آپ کو دوستی میسر آ جائے---- عسکری کو پھر سے اپنے افسانوں کے بجائے اپنے نظریات سے متاثر کر کے اپنی صفوں میں لائیے اور اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو اس تحریک سے آپ تو دامن نہ چھڑائیے جسے آپ کے فن اور آپ کے اثرات پر ہمیشہ ناز رہے گا۔ اور پھر برا نہ مانیے گا' ترقی پسند انجمن نے آپ سے کبھی برا برتاؤ تو نہیں کیا۔ حسن عسکری علانیہ ''ادب برائے ادب'' کے قائل ہیں۔ مگر ان کے خیال میں:

> ''پاکستانی ادیب اب اس مہم کا آغاز کرنے والے ہیں کہ جن اقدار اور تصورات کا نام پاکستان ہے' انہیں افسانے اور نظمیں لکھ کر خود سمجھیں اور دوسروں کو سمجھنے کا موقع دیں۔ ہم صرف اس طرح پاکستان کے استحکام میں مدد دے سکتے ہیں۔''

یہی ادب برائے زندگی اور ادب برائے پروپیگنڈا اور ادب برائے انسان ہے۔ اگر حسن عسکری نے الفاظ پورے خلوص سے لکھے ہیں تو وہ سب سے الگ ایک

ٹھنٹھ پر بیٹھے کیوں اونگھ رہے ہیں۔ یہی تو ترقی پسندی ہے۔ اسی کے تو آپ علمبردار ہیں، اور اب آپ کو ترقی پسندی کے نام تک سے چڑ ہے---! ''اُردو ادب'' میں آپ صرف اُردو ادب درج کرنا چاہتے ہیں، مگر خالص اُردو ادب تو انھی تاثرات کا اظہار ہوگا جو حسن عسکری نے اوپر کے الفاظ میں نمایاں کیے ہیں۔ اور اسی کو ترقی پسندی کہا جاتا ہے۔ آخر اس دوغلی پالیسی کا مطلب کیا ہے؟ حسن عسکری صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ پاکستان کے ادبی ڈکٹیٹر بننا چاہتے ہیں (اور یہ سلطانیِ جمہور کا زمانہ ہے) اور ادب برائے ادب کے نقارے پر تعمیر پاکستان یعنی ترقی پسندی کی چوب بہت بھونڈا شور پیدا کرتی ہے۔

سعادت بھائی! میں آپ کو دس برس سے جانتا ہوں۔ آپ کے خلوص کا معترف اور آپ کی صاف دلی کا مداح ہوں۔ مجھے آپ کی فنی عظمت سے بھی انکار نہیں۔ لیکن بحیثیت ایک ادیب کے آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ الفاظ کے الٹ پھیر اور نطق کی بھول بھلیوں میں نہ الجھیے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک آتشیں قلم اور آپ کے ذہن میں ایک شدید جذبہ ہے۔ اس جذبے اور اس قلم کا خوشگوار تعاون آپ کو جبھی میسر آ سکتا ہے جب آپ زندگی کے عکاس اور نباض رہیں (جیسا کہ آپ اب تک ہیں)۔ آپ کی ذات سے پاکستان کو ان گنت توقعات ہیں۔ اس تعمیری دور میں ادب برائے ادب کی افیون سے بچیے۔ ''اُردو ادب'' ضرور نکالیے مگر ایک معیّن نظریے کے ساتھ۔ حسن عسکری سے ضرور تعاون کیجیے مگر ان کے نظریات کو مشرف بہ زندگی کرنے کے بعد--- اور انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی جن سرگرمیوں سے آپ کو شکایت ہے، ان کا برملا اظہار کیجیے۔ انجمن کی اصلاح کا بیڑا اٹھائیے۔ ساحل پر بیٹھ کر ملاحوں کے ڈوبنے کا نظارہ کرنے والوں سے یہ کہیے کہ بعض اوقات طوفانی موجیں ساحل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ ہمارے قریب آئیے اور اس ترقی پسندی کو سہارا دیجیے

جسے پاکستان کا استحکام چاہیے، پاکستانی عوام کی فلاح چاہیے، جمہوریت اور مساوات چاہیے، اور یقین رکھئے کہ آپ فن کی اس بلندی پر ہیں جہاں کسی نقاد کو آپ کے فنی کمالات کا اچانک الہام ہونے لگے تو یوں سمجھئے کہ اسے آپ سے کچھ کام ہے۔ ورنہ میرے بھائی! سورج کو سورج کہہ دینے سے سورج کے انوار میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔

آپ کا بھائی
ندیم

ن۔م۔ راشد

یہ ۱۹۳۰ء۔۳۱ کا ذکر ہے جب میں گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر جناب فضل الٰہی چشتی تھے جو نامور شاعر ن۔م۔راشد کے والد تھے۔ اُن دنوں راشد صاحب گورنمنٹ کالج لاہور میں شاید ایم۔اے کے طالب علم تھے۔ جب بھی وہ اپنے والدین سے ملنے شیخوپورہ آتے' ہماری کلاس میں ضرور تشریف لاتے اور ہمیں انگریزی کا سبق دیتے۔ سب لڑکے ان کی شخصیت سے متاثر تھے۔ ویسے تو اپنے والد صاحب کی طرح ان کا رنگ بھی گہرا سانولا تھا مگر ان کا اونچا قد' مناسب ناک نقشہ اور تک سک سے درست لباس ان کی شخصیت کی دلآویزی میں مزید اضافہ کرتا تھا۔ یوں بھی میٹرک میں پڑھنے والے بچوں کا ایم۔اے' اور وہ بھی (شاید) ایم۔اے انگریزی میں پڑھنے والے جوانِ رعنا سے مرعوب ہونا قدرتی تھا' خاص طور پر اس لیے بھی کہ وہ ان کے نہایت سخت گیر ہیڈ ماسٹر صاحب کے صاحبزادے تھے۔

ان کی سخت گیری کی ایک ہلکی سی جھلک یہ ہے کہ وہ ہمیں الجبرا جیومیٹری پڑھاتے تھے۔ ایک روز تختۂ سیاہ پر انہوں نے کھریا مٹی سے ایک مثلث بنائی۔ پھر اس کے زاویوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رُکے' ڈسٹر اٹھا کر تختۂ سیاہ

پر سے مثلث کو مٹا دیا اور فرمایا ''یہ سبق کل ہوگا۔''

ہماری جماعت کے ایک طالب علم ہم سب سے پانچ چھ سال بڑے تھے۔ نام یاد نہیں۔ آواز بہت تیز تھی۔ قد بہت اونچا تھا۔ بہت شریر تھے۔ ہمیشہ کلاس روم کے آخری بنچوں پر بیٹھتے تھے۔ جب ہیڈ ماسٹر صاحب نے جیومیٹری کا یہ سبق کل پڑھانے کا ذکر کیا تو اس نے اپنا سر ڈیسک میں کسی حد تک چھپا کر آہستہ سے کہا ''گھر سے تیاری کر کے آنا تھا نا۔'' اس کی آواز بہت کراری اور گونجیلی تھی۔ اس نے یہ الفاظ بہت احتیاط سے کہے تھے مگر اس کی آواز ایسی منفرد تھی کہ سب لڑکوں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی اس آواز کا منبع پہچان چکے تھے۔ انتہائی غصے میں اس کے پاس پہنچے اور کڑکے ''گیٹ اپ!''---- وہ کھڑا ہوا تو بولے ''لیو دی کلاس---- گیٹ آؤٹ----!'' وہ گھبراہٹ میں ذرا رُکا تو ہیڈ ماسٹر صاحب کے ہاتھ کا بید شڑاپ کی آواز کے ساتھ اس کی پیٹھ پر پڑا اور وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ تب ہیڈ ماسٹر صاحب سیدھے اپنے دفتر گئے اور اس کا نام سکول کے طلبا کی فہرست سے خارج کر دیا۔

اتفاق سے دوسرے ہی روز راشد صاحب ہماری کلاس میں تشریف لے آئے۔ وہ جونہی کمرے میں داخل ہوئے مجھ سمیت چند بچوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور عرض کیا کہ آپ کے والد صاحب نے ہمارے ایک ہم جماعت کو جو نہایت سخت سزا دی ہے وہ معاف کرا دیجئے۔ راشد صاحب نے جرم کی تفصیل پوچھی تو میں نے سارا واقعہ من وعن بیان کر دیا۔ تب راشد صاحب بولے ''اس صورت میں تو لڑکے کو اس کی گستاخی کی سزا ضرور ملنی چاہیے نا احمد شاہ صاحب۔''

ہم سب منہ لٹکائے واپس اپنی نشستوں پر آ بیٹھے اور راشد صاحب نے پورا پیریڈ اپنے اساتذہ اور اپنے بڑوں کے ادب کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے گزار دیا۔ اس شام کو میں نے اپنے سرپرست چچا' پیر حیدر شاہ صاحب سے عرض کیا

کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہہ کر میرے ہم جماعت کی سزا معاف کرا دیں---
میں نے انہیں اس کی گستاخی کی نوعیت اس خوف سے نہ بتائی کہ آخر وہ بھی تو مجسٹریٹ ہیں' کہیں وہ بھی راشد صاحب کی طرح گستاخی کی سزا کو ضروری نہ قرار دے ڈالیں--- بہرحال انہوں نے کچہری جاتے ہوئے رک کر محترم چشتی صاحب سے اس طالب علم کی سفارش کر دی اور اسے معافی مل گئی۔ میں نے بعد میں اپنے ایک ہم جماعت سے سنا کہ وہ میٹرک پاس کرنے کے بعد پولیس میں بھرتی ہوگیا تھا۔

راشد صاحب سے میری دوسری ملاقات محترم اختر شیرانی کے گھر اور دفتر' واقع فلیمنگ روڈ (لاہور) میں ہوئی۔ ابتدا میں راشد صاحب' اختر شیرانی کی رومانی شاعری سے بہت متاثر تھے اور ان کے ہاں اکثر حاضر رہتے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ راشد ہی نے اختر شیرانی کو سانیٹ لکھنے کی ترغیب دی تھی۔ اختر صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ میری حیثیت ایک نوآموز کی تھی مگر جب میں نے ان سے شیخوپورہ سکول کا ذکر کیا تو ہنسے اور مجھ سے یوں گفتگو کی جیسے ہم دونوں برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اُن دنوں بھی راشد صاحب خاصے خوش پوش نظر آتے تھے۔ الفاظ کے تخلیقی استعمال پر بہت زور دیتے رہے اور کہتے رہے کہ شاعر جس زبان میں شاعری کرتا ہے' اسے اس زبان کی نزاکتوں سے ضرور آگاہی ہونی چاہیے۔

راشد کے والد جناب فضل الٰہی چشتی ضلع سرگودھا میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کے عہدے پر فائز تھے۔ اب تو میرا گاؤں ضلع خوشاب میں شامل ہے مگر اُن دنوں پورا علاقہ سون سکیسر ضلع سرگودھا ہی کا حصہ تھا اور گرمیوں کے موسم میں اضلاع سرگودھا' کیمبل پور اور میانوالی کے اعلیٰ حکام کچھ عرصہ سکیسر پہاڑ پر گزارنے آتے تھے جو ایک طرح سے ان اضلاع کا گرمائی صدر مقام تھا۔ شاید

چشتی صاحب بھی سکیسر آئے ہوئے تھے۔ میں اپنے گاؤں انگہ میں تھا جب مجھے اطلاع ملی کہ باہر راشد صاحب تشریف لائے ہیں۔ میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی۔ میں لپک کر باہر آیا۔ راشد صاحب اور ان کے ہمراہ آئے ہوئے قاضی مرید احمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انہیں بالا خانے میں بٹھایا اور گھر میں امی سے جا کر عرض کیا کہ جگ میں بہت ٹھنڈے گھڑے میں سے پانی لے کر شربت بنا دیجئے کہ میرے دوست اتنی تیز دھوپ میں پیدل چلتے ہوئے مجھ تک پہنچے ہیں---- اور جب میں جگ لیے بالاخانے پر آیا اور گلاس میں شربت ڈالنے لگا تو راشد صاحب بولے---- "پیاس تو مجھے یقیناً ہے کہ تیز دھوپ میں تین چار میل پیدل چل کر آیا ہوں مگر میں آپ کو ایک گلاس کی ایک چونی پیش کروں گا کہ حضرت علامہ صاحب کا یہی حکم ہے!"

میں چونی کا ذکر سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ راشد صاحب خاکسار تحریک میں شامل ہیں اور علامہ مشرقی کے پیروکار ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ راشد صاحب! یہ میرا گھر ہے اور میں نے شربت کی دکان نہیں کھول رکھی ہے۔ فرمایا "علامہ صاحب کا یہی حکم ہے کہ کسی مسلمان بھائی پر کسی صورت میں بار نہ بنو۔ اس کا پانی پیو یا کھانا کھاؤ تو اس کے دام ضرور ادا کر دو چنانچہ میں پانی کے اس گلاس کے دام ضرور ادا کروں گا۔"

راشد صاحب کے ہمراہ علاقے کے ایک گاؤں مردوال کے قاضی مرید احمد تھے جو اُن دنوں سکول میں ٹیچر تھے مگر زبردست مقرر تھے اور بعد میں وہ پنجاب اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوگئے تھے۔ ان سے میرا پرانا تعارف تھا۔ میں نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "راشد صاحب علامہ صاحب کے احکام کے سخت پابند ہیں۔ میرے ہاں کھانا کھایا ہے مگر اس کا ایک روپیہ ادا کر دیا ہے۔ ان کے اصرار پر مجھے ایک روپیہ قبول کرنا پڑا۔ آپ بھی چونی لے لیجئے۔"

میں نے عرض کیا کہ میرے ضمیر کے لیے تو یہ چونّی کلنک کا ٹیکا بن کر رہ جائے گی اس لیے میں آپ دونوں اصحاب سے دست بستہ منت کرتا ہوں کہ پانی پی لیجئے۔ راشد صاحب نے چونّی دیے بغیر اور قاضی صاحب نے راشد صاحب کی خاطر پانی پینے سے انکار کر دیا اور خدا حافظ کہتے ہوئے پیاسے تشریف لے گئے۔

میں ۱۹۳۹ء میں محکمۂ آبکاری میں سب انسپکٹر بھرتی ہوگیا۔ میں ملتان میں متعیّن تھا جب ایک روز میں نے راشد صاحب کو کچھ دور ایک تانگے سے اترتے اور اپنی طرف آتے دیکھا۔ مجھے نہایت مسرت بخش حیرت ہوئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ''اوور ایج'' ہونے سے بچنے کے لیے وہ ملتان ڈویژن کے کمشنر کے دفتر میں کلرک بھرتی ہوگئے ہیں۔ ہم بہت خوش تھے کہ ملتان میں چند روز ساتھ رہے گا مگر شاید جلد ہی انہیں محترم پطرس بخاری کے توسّط سے آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام اسسٹنٹ کی ملازمت مل گئی اور وہ ملتان میں زیادہ نہ رک سکے۔ اُن دنوں بخاری صاحب کی برکت سے معروف نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو ریڈیو کے محکمے میں دھڑا دھڑ بھرتی کیا جا رہا تھا چنانچہ راشد کے علاوہ کرشن چندر، منٹو، اوپندر ناتھ اشک، میراجی، ممتاز مفتی اور وشوامتر عادل وغیرہ کے علاوہ مولانا چراغ حسن حسرت بھی آل انڈیا ریڈیو کے عملے میں شامل تھے۔

میں تاریخیں یاد رکھنے کے معاملے میں بہت کوتاہ ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ۱۹۴۱ء کے آس پاس کا ذکر ہے کہ دہلی ریڈیو میں جدید نظم نگاروں کا ایک یادگار مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس میں حفیظ جالندھری، ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر تصدق حسین خالد، فیض احمد فیض، ن۔م راشد، میراجی، روش صدیقی، اسرار الحق مجاز اور چند دوسرے شعرا کے علاوہ میں نے بھی شرکت کی۔ میں منٹو کے ہاں ٹھہرا جو اس زمانے میں وہاں سکرپٹ رائٹر تھا۔ میں نے اپنی نظم ''نیا ساز نئی تان'' پڑھی جو میرے پہلے مجموعۂ کلام ''جلال و جمال'' میں شامل ہے۔ یہ نظم چار چار مصرعوں

کے ۱۳ بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند کا پہلا اور چوتھا مصرع اور اسی طرح ہر بند کا دوسرا اور تیسرا مصرع ہم وزن، ہم قافیہ اور ہم ردیف ہیں۔ داد تو مجھے ملی مگر منٹو نے یہ غضب ڈھایا کہ (شاید بسلسلہ دوست نوازی یا مہمان نوازی) مشاعرے کے فوراً بعد اس نے اپنی تیز آواز میں اعلان کر دیا کہ ندیم کی نظم مشاعرے میں پڑھی جانے والی باقی سب نظموں سے بدرجہا بہتر اور خوبصورت رہی۔ اس پر بیشتر شعرا مسکرا دیے مگر راشد غصے میں آ گئے۔ ان کے چہرے کا تاثر واضح طور پر اعلان کر رہا تھا کہ منٹو مبالغہ کر رہا ہے۔ منٹو کی تیز نظروں نے راشد کے ردِعمل کو پہچان لیا چنانچہ منٹو نے اسے وہیں سب کے سامنے بازو سے پکڑ کر کہا ''کیوں مسٹر این۔ایم۔راشد ! تمہارے تیور بتا رہے ہیں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں مگر کیا اس مشاعرے میں ندیم کی نظم سے بہتر کوئی نظم پڑھی گئی؟ اگر پڑھی گئی تو بتاؤ وہ کون سی نظم ہے؟ بہرحال یہ واضح کر دوں کہ تمہاری نظم تو بالکل نہیں ہے۔'' اس پر ایک قہقہہ پڑا اور راشد نے بھی بادلِ نخواستہ اس قہقہے میں مسکراہٹ کی حد تک شمولیت کرنا مناسب سمجھا' اور کچھ کہا تو صرف اتنا کہ یہ شخص کہیں بھی شرارت سے باز نہیں آتا۔

میں اس کے بعد بھی دوبارہ دہلی گیا اور ظاہر ہے منٹو ہی کے ہاں ٹھہرا۔ جب منٹو صاف ستھرے لباس میں' ایک ہاتھ میں پورٹیبل اُردو ٹائپ رائٹر اور دوسرے ہاتھ میں چمڑے کا بیگ اٹھائے (جس میں اس کے مسودات ہوتے تھے) ریڈیو سٹیشن جاتا تو مجھے بھی ساتھ لے جاتا۔ وہاں اس کی شوخی اور فقرے بازی سے کوئی بھی محفوظ نہ تھا۔ کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک کے علاوہ راشد کو بھی چھیڑتا رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے' میں ریڈیو سٹیشن کے ایک کمرے میں منٹو کے پاس بیٹھا تھا کہ راشد وہاں کسی کام سے آئے۔ مجھے دیکھا تو مصافحے کے لیے آگے بڑھے۔ پلٹ کر جانے لگے تو منٹو نے کہا کہ مسٹر ایم۔این۔راشد! تم ایسے

موضوعات پر کیوں لکھتے ہو جن کا تمہیں پوری طرح تجربہ نہیں ہوتا۔ مثلاً تم نے ایک نظم میں کہا ہے کہ ''اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے' زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں'' وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی کسی ہم رقص کے ساتھ رقص کیا ہے؟ ہمارے مشرق میں، تو عورت اور مرد کا آپس میں چھا ڈال کر رقص کرنے کا رواج نہیں۔ تو کیا تم نے مغرب کی کسی عورت کے ساتھ رقص کیا ہے؟ کیا تمہیں مغربی رقص کے Steps آتے ہیں؟ مجھے آتے ہیں۔ اِدھر آؤ۔ میرے ساتھ رقص کر کے دکھاؤ۔۔ سارا پول کھل جائے گا۔''

راشد نے نہایت GRIM ہو کر کہا ''منٹو کبھی تو سنجیدگی سے بھی کوئی بات کر لیا کرو۔''

اور منٹو بولا ''تو کیا یہ سب میں نے غیر سنجیدہ گفتگو کی ہے؟ میں تو نہایت سنجیدگی سے عرض کر رہا ہوں کہ جس چیز کا تجربہ نہ ہو اسے شاعری کا موضوع نہ بنایا کرو' سمجھے؟''

اور راشد نہایت ناگواری سے واپس چلے گئے۔

دہلی کے ایک سفر میں منٹو نے مجھے بتایا کہ ''فیض احمد فیض صاحب ایم اے او کالج امرتسر کے چند طلبا کو علی گڑھ یونیورسٹی دکھانے لے جا رہے ہیں اور دہلی میں ایک دن کے لیے رُکے ہیں۔ آج شام میں نے انہیں ایک ڈرنک پارٹی میں مدعو کیا ہے۔ تم تو بدنصیب ہو کہ ڈرنک ورِنک نہیں کرتے مگر تمہیں میرے ہمراہ اس پارٹی میں شامل ہونا ہوگا۔'' ظاہر ہے میں کیسے انکار کر سکتا تھا۔ کسی ہوٹل میں' جس کا نام یاد نہیں' یہ پارٹی برپا ہوئی۔ کم و بیش پندرہ بیس اصحاب مدعو تھے۔ منٹو کے اور میرے علاوہ فیض' راشد' بیدی' کرشن' میرا جی' اشک' ممتاز مفتی' حفیظ جاوید' دو چار اَور شعرا (جن کے نام یاد نہیں آ رہے ہیں) اور مولانا چراغ حسن حسرت اس محفل میں شامل تھے۔ شرب و نوش کا آغاز ہوا تو میں نے

ویٹر سے کہا کہ میرے سامنے رکھا گلاس اٹھا لے جائے۔ مولانا حسرت میرے قریب تشریف فرما تھے بولے ''کیوں کیا آپ بوتل منہ سے لگا کر پئیں گے؟'' سب لوگ ہنسے تو منٹو نے وضاحت کی کہ ندیم نہیں پیتا۔ اس پر مولانا حسرت نے فرمایا کہ آپ کو مولانا غلام مرشد کا رشتہ دار ہونے کا کتنا نقصان ہوا۔ بہرحال جب آپ رندوں کی اس محفل میں شامل ہیں تو کچھ تو کیجئے۔ ہمیں سوڈے کی بوتلیں ہی کھول کھول کر دیجئے۔'' میں نے یہ ڈیوٹی بسروچشم قبول کی اور یار لوگ خوش گپیوں کے ماحول میں پینے پلانے لگے۔

جب سب پر سرور کی کیفیت طاری ہونے لگی تو عجیب بات یہ ہے کہ سب مجھ سے مخاطب ہو کر بات کرتے تھے۔ شاید یہ بات ان کے تحت الشعور میں تھی کہ ایک یہی شخص ہوش میں ہے۔ مولانا حسرت نے فرمایا ''اس محفل میں شعرا بھی موجود ہیں۔ تو کیوں نہ ان سے ایک ایک غزل سن لی جائے۔ کیوں مولانا ندیم صاحب؟''

غزلیں سنائی جانے لگیں۔ جب راشد کی باری آئی تو انہوں نے معذرت کی کہ وہ تو غزل کہتے ہی نہیں۔ اس پر مولانا نے کہا ''دیکھو راشد! غزل ضرور کہا کرو۔ نہیں کہو گے تو ایک وقت آئے گا جب قافیے کی جستجو میں تمہارا یہ عالم ہوگا کہ آگے آگے قافیہ دوڑ رہا ہوگا اور اسے پکڑنے کے لیے پیچھے پیچھے تم بھاگ رہے ہو گے مگر قافیہ تمہیں پکڑائی نہیں دے گا۔ اپنے ساتھ بدسلوکی کرنے والوں کو قافیہ پکڑائی نہیں دیتا۔'' راشد سمیت سب حاضرین دیر تک ہنستے رہے۔ (مولانا حسرت کی پیش گوئی درست نکلی۔ بعد میں راشد نے غزل کہنے کی کوشش کی۔ ''ایران میں اجنبی'' کے پہلے ایڈیشن میں یہ غزلیں شامل ہیں۔ ان غزلوں کو نہایت ناکام غزلیں ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ راشد نے اچھا کیا کہ اس کتاب کے بعد کے ایڈیشنوں میں سے اس نے یہ غزلیں خارج کر دی تھیں)۔ آخر

مولانا حسرت نے فرمایا کہ غزل کا ایک اور دور ہو جائے۔ اس پر منٹو نے کہا کہ نہیں۔ اب نظم چلے گی۔ مولانا نے کہا کہ نہیں غزل ہوگی۔ منٹو نے اصرار کیا کہ ہوگی تو نظم ہوگی ورنہ کچھ نہیں ہوگا۔ میں اس لڑائی کی تفصیل منٹو پر اپنے مضمون میں بیان کر چکا ہوں۔ یہاں تکرار کی ضرورت نہیں۔ اس اختلافِ رائے کا نتیجہ اس مضمون میں تفصیل سے درج ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے دنوں میں راشد بھی فیض وغیرہ کی طرح انگریز کی فوج میں بھرتی ہو کر شاید کیپٹن کہلانے لگے۔ جوش ملیح آبادی نے ان اہلِ فن کی اس حیرت انگیز قلابازی کی شدید مذمت کی اور ایک بھرپور نظم لکھی جس کا عنوان ''چند روز اَور'' فیض کی نظم ہی سے لیا گیا تھا۔ اس نظم میں جوش نے انگریز کی فوج میں بھرتی ہونے والوں کی جی کھول کر تضحیک کی تھی۔ میں ان دنوں رسالہ ''ادبِ لطیف'' کا مدیر تھا۔ جوش صاحب نے نظم ''ادبِ لطیف'' میں اشاعت کے لیے بھجوائی۔ میرے لیے مشکل یہ تھی کہ اس نظم کی اشاعت سے راشد، فیض، تاثیر وغیرہ کو مجھ سے شدید شکایت ہوتی۔ میں نے سوچا اس نظم کی نقول ان سب کو بھجواؤں اور یہ نظم ان شعرا کے ردِعمل کے ساتھ رسالے میں درج کر دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا مگر ان حضرات نے چپ سادھ لی۔ وہ یہ نظم ''پی'' گئے اور میں نے نظم کی اشاعت روک لی۔ اس نظم کا مفصل ذکر میں نے فیض احمد فیض سے متعلق اپنے مضمون میں کیا ہے۔

یہ ۱۹۴۵ء کا ذکر ہے میں ''ادبِ لطیف''، ''پھول'' اور ''تہذیبِ نسواں'' کی ادارتوں کے علاوہ جوانی کے جوش وخروش میں قطعہ، غزل، نظم، افسانہ اور مزاح وغیرہ تخلیق کرنے کے شوق میں تھکن سے چور ہو کر ایک طرح اعصاب زدگی کا شکار ہو گیا اور اپنے گاؤں انگہ میں اپنی ماں کی پناہ میں چلا گیا۔ جب صحت یاب ہونے لگا تو مجھے برادرِ مکرم سجاد سرور نیازی کی طرف سے بلاوا آیا کہ پشاور ریڈیو

سٹیشن پر سکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے فوراً پہنچو۔ نیازی صاحب ان دنوں پشاور ریڈیو کے سٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ ان کے خانوادے سے ہمارے پرانے مراسم تھے چنانچہ میں فوراً پہنچا اور وہاں نیازی صاحب ہی کے گھر میں ڈیڑھ دو برس تک رہائش پذیر رہا۔ ان کی صاحبزادی معروف گلوکارہ ناہید نیازی' جن کا اصل نام شاہدہ ہے' اس زمانے میں چھوٹی سی پیاری سی بچی تھیں جو میرے چھوٹے موٹے کام کر دیتی تھیں۔ نیازی صاحب کے نائب پہلے تو ایک صاحب محمد اقبال تھے مگر پھر ان کی جگہ ن۔م۔ راشد تشریف لے آئے۔ ان کی آمد میرے لیے حد درجہ باعث مسرت تھی' مگر اس دوران میں پے در پے دو تین ایسے واقعات ہوئے کہ راشد صاحب کے ذہن میں میرے متعلق اور میرے ذہن میں راشد صاحب سے متعلق بعض تعصبات پیدا ہو گئے۔

میں ریڈیو سٹیشن کے جس کمرے میں بیٹھتا تھا' اسی میں ڈاکومینٹری فلموں کے ماہر اے۔ قدوس صاحب اور مشہور ڈرامہ نویس انصار ناصری صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ راشد صاحب فرصت ملنے پر کبھی کبھار ہمارے کمرے میں آتے تھے اور ظاہر ہے' ان کے ساتھ ادبی اور فنی موضوعات پر ہی گفتگو ہوتی تھی۔ ایک روز میں فراق گورکھپوری کی جدید غزل کی تعریف کرنے لگا تو راشد صاحب فوراً معترض ہوئے اور فرمایا کہ حفیظ جالندھری' فراق سے بدرجہا بہتر غزل کہتے ہیں۔ حفیظ کی غزل قدیم لہجے کی یقیناً عمدہ غزل تھی مگر غزل کے حوالے سے انہیں فراق کے مقابل لانا مجھے بھلا نہ لگا چنانچہ ہمارے درمیان دونوں شعرا کی غزلوں کی انفرادیتوں کی بحث چل پڑی۔ آخر راشد صاحب نے کہا "دیکھیے غزل کہنے والے شعرا کے سلسلے میں میرے پاس ایک کسوٹی ہے۔ اگر کوئی شاعر اس کسوٹی پر کھرا اترتا ہے تو ٹھیک ورنہ اسے وہ درجہ نہیں دیا جا سکتا جو عموماً دیا جاتا ہے۔ کسوٹی یہ ہے کہ اگر فراق آپ کا پسندیدہ غزل گو ہے تو آپ کو اس کے

کم سے کم سات ایسے اشعار ازبر ہونے چاہئیں جو واقعی اچھے اور معیاری اشعار ہوں۔ انصار ناصری اور قدوس یہاں موجود ہیں۔ اب فراق کے سات شعر سنائیے۔ اچھے ہوئے تو یہ اصحاب ان کی داد دیں گے ورنہ خاموش رہیں گے۔ چلیے سنائیے سات شعر۔''

سات کیا' اُس زمانے میں تو مجھے فراق کے ستر عمدہ اشعار یاد تھے' سو میں نے سات شعر سنائے تو حاضرین نے ہر شعر پر کھل کر داد دی۔ تب میں نے راشد صاحب سے عرض کیا کہ ''یہی کسوٹی حفیظ جالندھری کے سلسلے میں بھی استعمال ہونی چاہیے چنانچہ راشد صاحب! اب آپ حفیظ صاحب کی غزل کے سات بھرپور شعر سنائیے۔''

راشد صاحب اس پر تیار ہوگئے۔ انہوں نے بسم اللہ اس شعر سے کی:

کشتی خدا پہ چھوڑ کے ' بیٹھا ہے مطمئن
دریا میں پھینک دوں نہ کہیں ناخدا کو میں

میرے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے ''راشد صاحب! اس شعر میں لفظ ''پھینک'' کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔''

اس پر راشد صاحب ایک دم بھڑک اٹھے۔ بولے ''میں تنقید کے اس انداز کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے باقی اشعار نہیں سناؤں گا۔'' پھر وہ اٹھے اور کمرے سے نکل گئے۔ مجھے ان کی اس حد تک کی زود رنجی کا علم نہ تھا۔ افسوس ہوا کہ انہوں نے میری (بزعمِ خویش) ''شگفتگی'' کا بُرا مانا۔

ریڈیو سٹیشن کے سٹاف کی ایک میٹنگ میں کسی صاحب نے تجویز پیش کی کہ اردو کے نئے افسانہ نگاروں کے افسانے ان کی اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے نشر کرنا چاہئیں۔ میں نے اس تجویز کی تائید کی۔ افسانہ نگاروں کے نام تجویز ہونے لگے تھے تو راشد صاحب نے میری منہ بولی بہنوں خدیجہ مستور اور ہاجرہ

سرور کے بارے میں ایک نازیبا جملہ کہہ دیا۔ میں غصّے میں اٹھ کھڑا ہوا تو راشد صاحب خاموش ہو گئے اور جب میٹنگ ختم ہوگئی اور راشد صاحب اکیلے رہ گئے تو میں ان کے کمرے میں آیا اور انتہائی غصّے میں' کچھ اس طرح کے الفاظ استعمال کیے کہ---"راشد صاحب! ابھی ابھی آپ نے میری بہنوں پر جو جملہ کسا ہے اس کا جواب اس طرح بھی دیا جا سکتا تھا کہ میں پورے سٹاف کے سامنے آپ کے منہ پر ایسا تھپڑ مارتا کہ آپ کا چہرہ پھر جاتا' مگر یہ سلوک صرف اسسٹنٹ سٹیشن ڈائریکٹر کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ میری مشکل یہ ہے کہ آپ بہت عمدہ شاعر بھی ہیں اس لیے میں نے محض لفظی احتجاج پر اکتفا کی ہے۔" اور میں یہ کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔ اس واقعے کو راشد صاحب نے ایک سے زیادہ بار دہرایا ہے اور اپنے دفاع میں صرف یہ کہا ہے کہ انہوں نے تو وہ جملہ صرف ازراہ "شگفتگی" کہہ دیا تھا۔ یوں' بر سبیل شگفتگی ایک طرح سے ہمارا حساب برابر ہوگیا۔

مگر ایک اور واقعے نے تو میرے قدم اکھیڑ کر رکھ دیے۔ آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی فرقہ وارانہ فسادات کی جو آگ پورے برصغیر میں بھڑک اٹھی تھی اس کی زد میں لاکھوں آئے۔ مجھے ان سب کا دکھ ہے۔ انہی میں میرے ایک عزیز دوست اور خوبصورت افسانہ نگار حمید اختر بھی شامل تھے۔ وہ اپنی بہنوں کو نسدیوں سے بچاتے ہوئے انتہائی تکلیف دہ حالات میں لاہور پہنچے۔ انہیں فوری طور پر کسی معقول روزگار کی ضرورت تھی چنانچہ انہوں نے مجھے لکھا۔ میں نے نیازی صاحب سے بات کی۔ وہ شاید رخصت پر جا رہے تھے اس لیے مجھے مشورہ دیا کہ راشد صاحب سے بات کر لوں۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ خود بھی راشد سے کہہ دیں گے۔ میں نے راشد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر حمید اختر کے بارے میں بتایا کہ نوجوان اہل قلم میں انہیں ایک امتیاز حاصل ہے اور وہ رواں دواں اُردو لکھتے ہیں۔ انہیں میرے ہی شعبے سے وابستہ کر لیجیے تو بڑا کرم

ہوگا۔ راشد صاحب نے فرمایا کہ میں حمید اختر کو پشاور بلا لوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور جب وہ پشاور میں میرے ہاں تشریف لائے تو میں انہیں ساتھ لے کر راشد صاحب کے پاس پہنچا۔ تب میں نے ن۔م۔ راشد کی شخصیت میں سے ایک اور ایسی شخصیت برآمد ہوتے دیکھی جسے میرا ذہن آج بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔

میں نے حمید اختر کا تعارف کرایا۔ راشد صاحب بولے ''اچھا تو یہ ہیں !'' ---- میں نے کہا ''جی ہاں'' بجائے اس کے کہ راشد صاحب' حمید اختر سے ہاتھ ملاتے اور انہیں کرسی پر بیٹھنے کو کہتے' بولے ''یہ آج کے ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کا ایڈیٹوریل ہے۔ اس کا ترجمہ کر دیجئے۔'' میں نے عرض کیا کہ ''راشد صاحب! یہ مترجم نہیں ہیں' تخلیق کار ہیں۔ پھر مترجموں کا براڈکاسٹنگ میں کیا کام۔ میں نے آپ سے ان کا مکمل تعارف کرا دیا تھا۔ انہیں موعودہ جاب دیجئے۔ اور پھر آپ نے ابھی تک انہیں کرسی پر بیٹھنے تک کو نہیں کہا جبکہ یہ میرے اور آپ کے مہمان ہیں۔'' راشد صاحب نے میری باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور فرمایا ''ترجمہ تو انہیں کرنا پڑے گا۔'' میں نے دوبارہ کہا کہ میں ان کے بارے میں تفصیل سے عرض کر چکا ہوں۔ نیازی صاحب نے بھی آپ سے بات کی ہوگی۔ ان کی تعیناتی کا فیصلہ فرمایئے اور قصہ ختم کیجئے۔'' راشد صاحب نے اسی GRIM لہجے میں کہا ''ترجمہ تو انہیں کرنا ہی پڑے گا۔'' میں نے عرض کیا کہ ''راشد صاحب ! مجھے آپ سے ایک Stiff- Colored Bureocrat کے سے برتاؤ کی توقع نہیں تھی۔ میں حمید اختر کو معذرت کے ساتھ واپس لاہور بھیجے دیتا ہوں مگر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے ساتھ آپ کا برتاؤ سراسر غیر مہذب اور غیر شاعرانہ رہا۔ خدا حافظ۔'' بولے ''خدا حافظ'' اور قصہ ختم ہو گیا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ راشد صاحب نے ایک نوجوان ادیب سے اور پھر

مجھ سے اس طرح کا متکبرانہ سلوک کیوں کیا جبکہ ان کی شاعری میں اس نوع کے تکبر کا مجھے کہیں سراغ نہیں ملتا!

پھر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ایک روز پشاور میں یکایک فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ شاید اتوار کا دن تھا۔ صبح دوسری صبحوں کی سی خوب صورت تھی۔ مجھے اُس روز نیازی صاحب کی ننھی منی گاڑی (شاید بے بی آسٹن!) میں ان کی تین بچیوں کے ہمراہ ریڈیو سٹیشن جانا تھا جہاں انہیں بچوں کے پروگرام میں حصہ لینا تھا۔ پھر جب پروگرام ختم ہوا اور میں قمر شاہدہ اور ماہ رخ کو اسی گاڑی میں واپس گھر کی طرف لے جا رہا تھا کہ یکایک چاروں طرف سے فائرنگ ہونے لگی۔ فسادات شروع ہو چکے تھے۔ سڑک پر ایک بڑا ہوٹل تھا (نام شاید گرین ہوٹل تھا، صحیح نام بھول رہا ہوں) مجھے معلوم تھا کہ راشد صاحب نے اسی ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے میں بچیوں کو ساتھ لے کر ہوٹل کے اندر لپکا۔ شاید راشد صاحب نے اُوپر کھڑکی میں سے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے میری مدد کو پہنچے۔ ہم دونوں نے بچیوں کو بحفاظت اُوپر راشد صاحب کے کمرے میں پہنچایا۔ راشد صاحب نے انہیں تاکید کی کہ پلنگ اور صوفے پر لیٹی رہو۔ کیا پتہ کوئی گولی ادھر کھڑکی کا رخ کر لے۔ فائرنگ کم ہوئی تو اندازہ ہوا کہ فسادیوں نے اپنا مقصد پا لیا ہے اور اب لوٹ مار ہوگی۔ میں نے نیازی صاحب کو فون پر ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے راشد صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ بعد میں انہوں نے ایک فوجی جیپ بھجوائی جس کی دونوں طرف ہتھیار بند پہرے دار کھڑے تھے۔ میں بچیوں سمیت اس میں بیٹھا اور بخیریت گھر پہنچ گیا۔ راشد صاحب کے اُس روز کے ہمدردانہ سلوک نے مجھے متاثر کیا مگر آج تک یہ راز سمجھ میں نہیں آیا کہ حمید اختر کے ساتھ انہوں نے اتنی بدسلوکی کیوں کی؟

میں نے روزنامہ ''امروز'' کی ادارت سے مستعفی ہونے کے بعد ۱۹۶۳ء میں رسالہ ''فنون'' نکالا تو راشد صاحب کو بھی خط لکھا کہ وہ اپنے کلام سے نوازیں۔ غالباً وہ اُن دنوں ایران میں تھے۔ انہوں نے نظم تو بھیجی مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس کا معاوضہ کراچی میں میری بیٹی کو بھجوا دینا کیونکہ میں معاوضے کے بغیر کسی رسالے کو کلام نہیں بھجواتا۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ اس دوران میں ''فنون'' کی کسی اشاعت میں پروفیسر فتح محمد ملک صاحب کا ایک مضمون، جو نئے شاعروں کے بارے میں تھا، درج ہوا۔ اتفاق سے فیض، راشد اور میراجی کے علاوہ انہوں نے میرا ذکر بھی کیا تھا۔ اس پر راشد صاحب نے مجھے لکھا کہ آپ اپنے رسالے میں اپنی ہی تعریف چھپواتے ہیں تو کیا آپ نے یہ رسالہ اپنی تشہیر کے لیے جاری کیا ہے؟ میں نے تفصیل سے جواب عرض کیا کہ شعر میں بھی کہتا ہوں۔ اگر کسی مضمون میں میرا ذکر آ جائے تو میں کیا کروں۔ اس کے بعد وہ کئی بار لاہور تشریف لائے مگر ایک بار بھی مجھے مطلع نہ کیا۔ شاید وہ کسی وجہ سے مجھ سے کچھ زیادہ ہی خفا ہو گئے تھے۔

تب رسالہ ''افکار'' کراچی کا ضخیم ''ندیم نمبر'' شائع ہوا جس میں انہوں نے ترقی پسند ادب کے حوالے سے بعض باتیں ایک بڑے فنکار کے معیاروں سے خاصا نیچے اتر کر کی تھیں۔ اس پر ان کے بعض دوستوں نے انہیں لکھا کہ آپ نے یہ کیا جھک ماری ہے۔ چنانچہ راشد نے انتقال سے شاید ایک ''ماہ پہلے ''افکار'' ہی میں معاملہ صاف کر دیا اور میری شاعری کی تعریف مبالغے کی حد تک کر دی۔ انہوں نے یہ تک لکھا کہ جس شاعری کا Inspiration ندیم پر اترا وہ دراصل مجھ پر اترنا چاہیے تھا! معاف کر دینے والوں میں مجھے ''فرسٹ کلاس'' حاصل ہے اس لیے معاملہ برابر ہو گیا مگر افسوس کہ اس خط کی اشاعت کے بعد راشد زیادہ دیر نہ جی سکے۔

تب میں نے حلقۂ اربابِ ذوق لاہور میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم صاحب کی زیرِ صدارت راشد کے کمالاتِ فن پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ ساتھ ہی روزنامہ "ڈان" (کراچی) میں انگریزی کے ایک مضمون میں راشد کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔

میں راشد کی شاعری کا ہمیشہ سے معترف رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے معاصرین میں شاید ہی کوئی اس کے ہم پلّہ ہو۔ وہ صحیح معنوں میں بڑا شاعر تھا۔ اور اگر اس کے مزاج و کردار میں چند کمزوریاں تھیں تو کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں۔

مدیر "افکار" کراچی کے نام ن۔م۔راشد کے کھلے خط کا ایک اقتباس۔ یہ شاید ان کا آخری خط تھا:

جہاں تک ان کی (قاسمی صاحب کی) شاعری کا تعلق ہے میں ہمیشہ ان کی انفرادی حساسیت سے متاثر ہوا ہوں، جس میں ترقی پسندوں کی معیاری حساسیت کی آمیزش ضرور گاہے گاہے ہوئی اور بعض دفعہ اسلامی اخلاقی کلیوں کا الجھاؤ بھی پیدا ہوا۔ لیکن انہوں نے جس طرح ہمارے اردگرد چھائی ہوئی زندگی کی روشن اور بسیط، دل آویز اور موثر تصویریں اپنے کلام میں بھر دی ہیں یہ بات کسی اور شاعر کو ہمارے زمانے میں نصیب نہیں ہوئی۔ ایک نظیر اکبر آبادی زندگی کا، اسی سطح پر، عاشق نظر آتا ہے اور ہمارے زمانے میں ایک حد تک شاد عارفی اور فاخر ہریانوی لیکن ان کے ہاں فکر کا وہ تار و پود نہیں جو ندیم کے کلام میں ہے۔ پھر اس ابلیسی زمانے میں کسی شاعر کا ہر قسم کی آلودگی سے اپنا دامن بچا لینا

اور اس قسم کی پاک و منزہ بلکہ معصوم شاعری کرنا بہت بڑی ہمت کی دلیل ہے۔ بے شک ان کے کلام میں بعض دفعہ شعر اور صحافت ساتھ ساتھ برخوردارِ بستر بن کر لیٹ جاتے ہیں۔لیکن اس سے کسے مفر ہے۔ ہم سب کے پیشے اکثر ہمارے فن کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ قاسمی صاحب ہی کو کیوں الزام دیا جائے۔ مجھے ان کی طرف سے سب سے بڑی بے اطمینانی اس وجہ سے رہی کہ وہ پرگو واقع ہوئے ہیں۔ پرگوئی باتونی پن کی طرح اکثر آدمی سے کم درجے کی باتیں کہلوا دیتی ہے۔ لیکن آپ نے یہ تو بہت ہی اچھا کیا کہ ان کے چاروں مجموعوں کا ایک جامع انتخاب شائع کر دیا۔ ہم میں سے اکثر اپنے کلام کے انتخاب کی برکتوں سے صرفِ نظر کر دیتے ہیں۔ غالب نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس کا وہ پہلا دیوان ہی جو اس کے کلام کے انتخاب سے زیادہ نہ تھا' اس کی عالمگیر عزت اور رفعت کا باعث ہوا ہے۔ اس انتخاب کو میں کئی مرتبہ پڑھ چکا ہوں اور ہر بار قاسمی صاحب کی قدر و منزلت میرے دل میں بڑھتی چلی گئی ہے۔ ایران میں بعض شیعہ حضرات کا یہ ایمان ہے کہ قرآن دراصل حضرت علیؑ پر نازل ہونے والا تھا لیکن فرشتے کی غلطی سے حضرت محمدؐ کے ہاتھ لگ گیا! چنانچہ مجھے بھی یہ انتخاب پڑھ کر یقین ہونے لگا ہے کہ یہ وحی خود مجھ پر نازل ہونے والی تھی۔ لیکن ہاتف کی غلطی سے (غلط بخشی سے نہیں) قاسمی صاحب پر نازل ہوگئی! قاسمی صاحب مجھے معاف فرمائیں۔

***

فیض احمد فیض

فیض احمد فیض کے ساتھ میرے تعلقات کی نوعیت عجیب وغریب تھی کہ ان میں قرب و بعد کی کیفیتیں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں۔ ہم ایک ہی ادبی تحریک کے متعلق تھے اور صحافت کے ایک ہی ادارے میں برسوں ایک ساتھ کام کیا مگر میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ میں فیض صاحب سے ذرا فاصلے پر ہوں یا فیض صاحب مجھ سے ذرا فاصلے پر ہیں۔ میں نے اس صورت حال کا جب بھی تجزیہ کیا ہے، یہی نتیجہ نکلا ہے کہ:

☆ ہمارے درمیان طبقاتی تفاوت تھا۔

☆ پینے پلانے کی محفلوں میں میری عدم شرکت اس درمیانی فاصلے کا ایک اور اہم سبب ہے۔

ان کے علاوہ کوئی سبب میری سمجھ میں نہیں آیا اور اگر کوئی اور سبب سر اٹھاتا بھی ہے تو میں اسے رد کر دیتا ہوں کہ اگر میں اسے رد نہیں کروں گا تو فیض صاحب سے میری نیاز مندی داغ دار ہو جائے گی۔

فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات مولانا عبدالمجید سالک صاحب کے ہاں کسی شادی کے موقعے پر مسلم ٹاؤن میں سالک صاحب کے مکان پر ہوئی

تھی۔ مولانا سالک صاحب یا ڈاکٹر تاثیر صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا جو مصافحے سے آگے نہ بڑھا کیونکہ فیض صاحب کے ساتھ ان کے احباب کا جو ہجوم تھا' وہ انہیں دور کھینچ لے گیا۔ اس کے بعد ان سے میری ملاقات دہلی میں ہوئی۔ آل انڈیا ریڈیو نے ''جدید شعرائے اُردو'' کا ایک بڑا مشاعرہ منعقد کیا تھا اور مجھے بھی بلا بھیجا تھا۔ میں سال یاد رکھنے کے سلسلے میں نہایت درجہ کوتاہ ہوں' مگر بہرحال اس مشاعرے کا انعقاد ۱۹۴۰ء-- ۱۹۴۱ء میں کسی تاریخ کو ہوا تھا۔ میں ملتان میں سب انسپکٹر محکمہ آبکاری متعین تھا۔ وہاں سے دہلی آیا۔ اپنے عزیز دوست سعادت حسن منٹو کے ہاں قیام کیا۔ منٹو اُس زمانے میں دہلی ریڈیو سٹیشن سے بحیثیت سکرپٹ رائٹر منسلک تھے۔ مشاعرے کے سب شرکا کے نام تو یاد نہیں' مگر جو یاد ہیں وہ یہ ہیں :

---- فیض احمد فیض' ایم ڈی تاثیر' تصدق حسین خالد' حفیظ جالندھری' ن۔م۔راشد' روش صدیقی' میرا جی' اسرار الحق مجاز وغیرہ۔ میں عمر میں ان سب شعرا سے چھوٹا تھا مگر جب مشاعرہ ختم ہوا تو منٹو نے ان بڑے شعرا کے ہجوم میں اعلان کیا کہ ندیم کی نظم آپ سب شعرا سے بہتر تھی۔ یہ کہہ کر منٹو نے سراسر زیادتی کی تھی مگر اسے اپنی بات کہنے سے کون روکتا۔ ہر شاعر کا اپنا اپنا ردعمل تھا۔ فیض صاحب منٹو کا یہ اعلان سن کر مسکراتے رہے اور ن۔م۔راشد یہ کہہ کر رہ گئے کہ یہ شخص کسی بھی مقام پر شرارت سے باز نہیں آتا۔

اُن دنوں اُردو ہندی کا لسانی جھگڑا اوج پر تھا۔ منٹو کو ایک عجیب شرارت سوجھی۔ اس نے سب شعرا کو جمع کر کے کہا کہ آپ لوگ ایک ایک ایسی نظم لکھیے جو نہ اُردو میں ہو نہ ہندی میں۔ بلکہ کسی بھی زبان میں نہ ہو۔ آپ لوگوں کا لہجہ اور اسلوب بولے۔ بے معنی گھڑے ہوئے لفظوں کے آہنگ ہی سے سامعین اندازہ لگا لیں گے کہ یہ فیض کی نظم ہے اور یہ راشد کی اور یہ اپندر ناتھ اشک کی۔

سب تو نہیں، البتہ فیض صاحب نے، اشک نے اور شاید راشد نے بھی بے معنی الفاظ کی نظمیں کہیں۔ ایک نظم میں نے بھی گھڑی۔ عنوان تھا ''بھونرا'' ---- اور بھونرے کے پروں کی آواز کے سے الفاظ گھڑ کر چھ سات اشعار کی نظم لکھ ڈالی۔ پھر ان نظموں کی ریکارڈنگ کا مرحلہ آیا۔ سب نے اپنی نظمیں ریکارڈ کرائیں مگر فیض صاحب جب بھی ریکارڈنگ کے لیے سٹوڈیو میں داخل ہوئے، بے تحاشہ ہنستے ہوئے باہر بھاگ آئے۔ کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک انہیں پکڑ کر پھر سے سٹوڈیو کے اندر لے گئے مگر وہ پھر بھاگ لیے۔ ان کی ہنسی رکتی ہی نہیں تھی۔ کہتے تھے، منٹو نے ہم سب کو خوب فول بنایا ہے۔ اور منٹو پکارتا رہا کہ میں اس پروگرام کو نشر کر کے اُردو ہندی کا جھگڑا کرنے والوں کو فول بناؤں گا۔ آخر کار فیض اپنی بے معنی نظم ریکارڈ کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ میں نے بعد میں سنا کہ یہ نظمیں دہلی ریڈیو سٹیشن سے نشر ہوئیں تو بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب نے بھی سنیں اور کوئی غلط اثر لینے کی بجائے وہ بے حد محظوظ ہوئے۔

میں دہلی ہی میں تھا جب فیض صاحب ایم۔اے۔او کالج امرتسر کے طلبا کی ایک ٹیم کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لے جاتے ہوئے دہلی میں رکے۔ میرے عزیز دوست اور میزبان سعادت حسن منٹو نے ان کے اعزاز میں ایک ہوٹل میں ایک ڈرنک پارٹی کا اہتمام کیا۔ میں نے اس دعوت کی تفصیل منٹو سے متعلق اپنے مضمون میں درج کردی ہے جس میں غزل اور نظم کے مسئلے پر، عالمِ سرخوشی میں، مولانا چراغ حسن حسرت اور سعادت حسن منٹو میں دلچسپ ٹوتکار ہوئی تھی۔ اس دوران فیض مسلسل مسکراتے رہے تھے جیسے اس تنازعے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ انہی دنوں مجھے کرشن چندر نے بتایا کہ فیض آج کل ڈاکٹر تاثیر کی انگریز بیگم کی چھوٹی بہن ایلس کے ساتھ شادی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

قیام پاکستان کے موقعے پر میں پشاور ریڈیو سے متعلق تھا۔ ۱۹۴۸ء کے

آغاز میں لکھنؤ سے میری عزیز منہ بولی بہنیں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور اپنے جملہ عزیزوں کے ہمراہ لاہور آ چکی تھیں۔ میں نے پشاور سے لاہور آ کر انہیں متروکہ مکان اِلاٹ کرانے میں مدد دی اور پھر میں پشاور کی ملازمت سے مستعفی ہو کر لاہور آ گیا۔ لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ مجھے فوراً انجمن کی پنجاب شاخ کا سیکرٹری بنا دیا گیا۔ میں نے انہی دنوں بہن ہاجرہ مسرور کی معیت میں رسالہ ''نقوش'' جاری کیا جس میں دیگر معروف اہلِ قلم کے علاوہ فیض صاحب کی نگارشات بھی شامل رہیں۔ انجمن کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہوتے تھے۔ میں نے ایک اجلاس میں علامہ اقبال پر ایک مفصّل مضمون پڑھا جس میں علامہ کی سامراج دشمنی، مُلّائیت دشمنی اور جاگیردارانہ معیشت کی واضح مخالفت کے اعتراف و تحسین کے ساتھ ہی علامہ کے بعض پہلوؤں پر گرفت بھی کی تھی۔ اتفاق سے فیض اس اجلاس میں موجود تھے۔ میرے مضمون کے ختم ہوتے ہی وہ ناگواری بلکہ غصّے کے واضح تیوروں کے ساتھ بولے اور میرے مضمون کے اس حصے کی شدید مخالفت کی جس میں مَیں نے علامہ کی بعض سرگرمیوں، پر گرفت کی تھی۔ ان کی مخالفت تو مبارک تھی مگر مجھے عمر بھر یہ افسوس رہا کہ فیض صاحب نے میرے دو تین اعتراضات کا کوئی جواب دینے کی زحمت نہ کی بلکہ زیادہ زور اس نکتے پر دیتے رہے کہ شعر و ادب کی بڑی شخصیتوں کی مثبت کارکردگی کے اعتراف کے بعد ان کی بعض منفی سرگرمیوں کو نظرانداز کر دینا ہی مناسب ہوتا ہے۔ یہ ساری بحث کسی رسالے یا اخبار میں شائع بھی ہوئی تھی مگر افسوس کہ مجھے اس رسالے یا اخبار کا نام یاد نہیں۔ علامہ کے بارے میں میرے اس مقالے کے خلاف روزنامہ ''احسان'' کے مدیر ابوسعید بزمی (مرحوم) نے دو روز تک طویل طویل اداریے لکھے تھے اور مجھے بہت بری طرح گردن زدنی قرار دیا تھا۔

فیض انجمن کے ہفتہ وار اجلاسوں میں کبھی کبھار شرکت کر لیتے تھے مگر ان کی تشریف آوری میں وہ باقاعدگی نہیں تھی جیسے ابن انشا' ابراہیم جلیس' حمید اختر' عبداللہ ملک' عارف عبدالمتین' ظہیر کاشمیری' احمد راہی اور دوسرے کئی ترقی پسند مصنفین نے مدتوں اختیار کیے رکھی۔ دراصل فیض صاحب بُورژوا قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور انہی کی صحبت میں خوش رہتے تھے۔

نومبر ۱۹۴۹ء کی کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس منعقدہ لاہور کو تحریک میں ''لینڈ مارک'' کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں شرکت کے لیے ہم نے روس کے علاوہ برطانیہ اور امریکہ کے ترقی پسند مصنفین کو بھی مدعو کیا مگر صرف روسی اہلِ قلم کا ایک چہار رکنی وفد لاہور آ سکا اور وہ بھی کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد پہنچا' مگر ان چاروں اصحاب کی آمد اور لاہور میں ان کا چند روز قیام ادبی تاریخ کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ یہ اہلِ قلم پاکستانی ادبا و شعرا کے لیے روس میں شائع ہونے والی ادبی کتابوں کے تحائف لائے تھے جو میں نے انجمن کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے' برکت علی محمڈن ہال (بیرون موچی دروازہ) کے ایک جلسۂ عام میں وصول کیے اور پشکن' دوستووسکی' طالسطائی' چیخوف' گوگول' گورکی' مایا کوفسکی' ایلیا اہرن برگ وغیرہ وغیرہ کی تخلیقات کے یہ انگریزی تراجم میں نے انجمن کے دفتر پہنچا دیے جنہیں دوسرے ہی دن پولیس دفتر پر چھاپے کے پردے میں سمیٹ کر لے گئی۔ میں نے اس ظلم کے خلاف فیض صاحب سے درخواست کی کہ وہ علم و ادب کا یہ خزانہ انجمن کو واپس دلوا دیں کیونکہ قریب قریب ہر دور میں اربابِ حکومت سے ان کے خاصے تعلقات ہوتے تھے۔ انہوں نے یقیناً کسی سے کہا بھی ہوگا مگر خدا ہی جانے کہ ادب کا یہ خزانہ کہاں دفن کر دیا گیا۔

فیض صاحب کی ترقی پسندی تو کسی بھی شک و شبہ سے بالا تھی مگر ترقی پسندوں کی سرگرمیوں میں وہ بھرپور دلچسپی کم ہی لیتے تھے جس کی ان سے توقع کی

جاتی تھی۔ جب نومبر ۱۹۴۹ء کی کانفرنس کے سلسلے میں انجمن کے نئے منشور اور کانفرنس میں پیش کی جانے والی قراردادوں پر بحث مباحثے کے لیے ترقی پسند مصنفین مل بیٹھتے تھے تو فیض صاحب ان محفلوں میں شاذ ہی شرکت کرتے تھے۔ اسی کانفرنس میں اُس قرارداد کو بھی پیش ہونا تھا جس کا مضمون غیرترقی پسند ادیبوں کے بائیکاٹ پر مشتمل تھا' اور وہ مفصل منشور بھی منظور ہونا تھا جو انتہا پسندی کا شاہکار تھا' مگر فیض صاحب، نے ان میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ البتہ جب کانفرنس کے اجلاسوں کے لیے کسی ایک صدر کی بجائے ایک ''پریزیڈیم'' کا فیصلہ ہوا تو فیض صاحب مان گئے اور وہ کانفرنس کی سب نشستوں میں مُطلبی فرید آبادی' ممتاز حسین' فارغ بخاری' ریاض روفی اور میرے پہلو بہ پہلو بیٹھتے رہے۔ جب کل پاکستان انجمن ترقی پسند مصنفین کے عہدیداروں کا انتخاب ہوا اور مجھے جنرل سیکرٹری قرار دیا گیا تو میں نے احتجاج کیا کہ فیض صاحب اور مُطلبی صاحب کے سے سینئر حضرات کی موجودگی میں مجھے اس عہدے کے لیے نامزد نہ کیا جائے۔ مگر اکثریت نے میری گزارشات پر توجہ نہ دی۔ البتہ میں نے اعلان کیا کہ ''ہم فیض صاحب کو بھاگنے نہیں دیں گے۔'' چنانچہ انہیں انجمن کا وہ ''خزانچی'' منتخب کیا گیا جس کی تحویل میں انجمن کا نہ صرف ایک روپیہ تک نہیں تھا بلکہ قرضہ ہی قرضہ تھا۔

گرمیوں کا آغاز تھا۔ میں نسبت روڈ کے مکان کی تیسری منزل کی چھت پر پڑا سو رہا تھا جب گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ اُن دنوں پولیس خانہ تلاشیوں اور گرفتاریوں میں بہت مصروف رہتی تھی۔ میں نے سوچا ایسا ہی کوئی سانحہ ہونے کو ہے۔ نیچے جا کر دروازہ کھولا تو فیض صاحب' سبط حسن صاحب (امپیریل الیکٹرک کمپنی کے) رحمٰن صاحب (اور شاید حمید اختر صاحب بھی) موجود تھے۔ میں نے سب سے مصافحہ کیا اور بیٹھک کا دروازہ کھولنے لگا تو فیض صاحب بولے ''نہیں ندیم صاحب' اس کی ضرورت نہیں ہے۔

ہم تو آپ کو صرف جگانے آئے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ ہم آدھی رات کو بھی سڑکوں پر بھٹکتے پھرتے ہیں اور آپ مزے سے سو رہے ہیں۔ آخر کیوں۔ سو آپ کو جگانے---- صرف جگانے کا فیصلہ ہوا۔ آپ جاگ گئے۔ بس ہم چلتے ہیں۔'' وہ سب ہنستے ہوئے پلٹ گئے اور مجھے یہ کہنے کا موقع ہی نہ دیا کہ سارا قصور تو آپ لوگوں کی شب بیداریوں کا ہے۔

نسبت روڈ کے مکان کی یہ بیٹھک (جو اب خالد احمد کی تحویل میں ہے) ادبا و شعرا کا خاص مرکز رہ چکی ہے۔ فیض صاحب یہاں تین چار بار تشریف لائے۔ بیشتر خدیجہ بہن کے افسانوں کے مجموعے کا دیباچہ لکھنے آتے' سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے اور لکھتے چلتے جاتے۔ ایک بار جب ہم لوگوں نے جگر اور مجاز کی آمد پر وائی ایم سی اے ہال میں مشاعرہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تو فیض صاحب شعرا کی فہرست مرتب کر کے لے آئے۔ سب نام ٹھیک تھے مگر ظہیر کاشمیری کا نام درج نہیں تھا۔ میں نے اس فروگزاشت کا ذکر کیا تو فیض صاحب نے کہا ''نہیں' ظہیر کو اس مشاعرے میں شامل نہیں کریں گے۔'' میں نے کہا ''کیوں نہیں کریں گے؟ ظہیر تو ترقی پسند مصنفین کا ایک بہت اہم اور سینئر شاعر ہے۔'' فیض صاحب نے خاصی ناگواری سے کہا ''کچھ بھی ہو' ظہیر اس مشاعرے میں شامل نہیں ہوگا۔'' میں فیض صاحب کی یہ ضد دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ یہ جو ایم اے او کالج امرتسر میں فیض اور ظہیر کے درمیان کسی نکتے پر چپقلش کی افواہ سنی تھی' تو اس میں کچھ سچائی بھی تھی۔ مگر میں سوچ تک نہیں سکتا تھا کہ فیض اتنی کم حوصلگی کا مظاہرہ کریں گے۔ آخر میرے اصرار پر وہ مان تو گئے مگر یہ شرط رکھی کہ ظہیر کو مدعو کرتے ہوئے کسی صورت میں ان کا نام نہ آئے! میں فیض کے اس تعصب کو آج تک ہضم نہیں کر پایا۔

سوا برس بعد فیض صاحب (اور سید سجاد ظہیر وغیرہ) راولپنڈی سازش

کیس کے تحت گرفتار کر لیے گئے اور مئی ۱۹۵۱ء میں ملک کے دونوں حصوں سے کتنے ہی ترقی پسند مصنفین کو محض احتیاطاً نظر بند کر دیا گیا اور انجمن بے ٹھکانا ہو کر رہ گئی۔ نظر بندی کے دنوں میں جب ہم مل بیٹھتے تھے تو سوچتے رہ جاتے تھے کہ فیض صاحب کا سا نرم مزاج شاعر فوجی طاقت کے ساتھ حکومت کا تختہ الٹنے کا اقدام کیسے کر سکتا ہے۔

نومبر ۱۹۵۱ء میں رہا ہو کر میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے ایک اور کل پاکستان کانفرنس کا اہتمام کیا۔ اس دوران میں پورے ملک کی شاخوں کی تائید کے ساتھ وہ انتہا پسندانہ قرارداد واپس لے لی جس میں بڑے بڑے اہل قلم کا بائیکاٹ کیا گیا تھا۔ کل پاکستان کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی۔ اس میں نہ صرف متذکرہ قرارداد باقاعدہ واپس لی گئی بلکہ منشور پر بھی نظر ثانی کی گئی اور قریب قریب وہی منشور منظور ہوا جو انجمن کے آغاز میں مرتب ہوا تھا۔ اس کانفرنس کے تین اجلاس تھے جن کی صدارت بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، مولانا عبدالمجید سالک صاحب اور پیر حسام الدین راشدی صاحب نے کی۔ اس کانفرنس میں بھی مجھے ہی جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا جبکہ میں نے ظہیر کاشمیری کا نام تجویز کیا تھا مگر ظہیر نے معذرت کر لی تھی۔

انہی دنوں فیض صاحب کا مجموعۂ کلام ''دستِ صبا'' جیل سے مرتب ہو کر ناشر تک پہنچا۔ فیض صاحب نے مجھے لکھا کہ میں مسودے پر ایک نظر ڈال لوں۔ میں نے بعض مقامات کے سلسلے میں شبہے کا اظہار کیا۔ فیض صاحب نے میرے بعض شبہات دور کر دیے اور بعض مقامات کو برقرار رکھا۔ کتاب شائع ہوئی تو اس کی افتتاحی تقریب کی صدارت مصورِ مشرق محترم عبدالرحمٰن چغتائی صاحب نے فرمائی۔ میں نے فیض کی شاعری پر ایک مقالہ پیش کیا اور اپنی وہ نظم بھی پیش کی جس کا ایک شعر یہ تھا:

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ ' بجز اذن کلام
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں

اس دوران میں فیض صاحب کے ساتھ خط و کتابت جاری رہی۔ دوستوں اور عزیزوں کو ان کا وہ حسین کلام جیل سے موصول ہوتا رہا جس کے بنیادی موضوع نے ان کے اس شعر میں تجسیم پائی

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

جب فیض اور سجاد ظہیر کی بے گناہی ثابت ہونے پر انہیں رہا کیا گیا تو مختلف تقریبوں اور دعوتوں میں ان کا بھرپور خیر مقدم ہوا۔ مجھے بطور خاص وہ بڑی دعوت یاد ہے جو نوابزادہ لیاقت علی خاں کے برادر نسبتی نوابزادہ امتیاز علی خان نے اپنی کوٹھی واقع لارنس روڈ پر برپا کی تھی۔ کھانے سے پہلے شراب کا دور چلا جس میں سب بلانوش خوب چہکے۔ انگریزی کے معروف استاد اور کمیونسٹ پارٹی کے دماغ پروفیسر ایرک سپرین کی توجہ میری طرف منعطف ہوئی اور انہوں نے شراب سے میری محرومی کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ نشے یا نیم نشے میں حاضرین یقیناً محظوظ ہوتے رہے مگر میں تادیر پروفیسر صاحب کا یہ ارشاد برداشت نہ کر سکا کہ ''مسٹر ندیم اگر آپ وسکی نہیں پیتے تو مجھے حکم دیجئے میں آپ کے لیے نلکے کا پانی لے آؤں۔'' پروفیسر ایرک سپرین نہایت شائستہ اور کلچرڈ دانش ور تھے مگر شراب ایسی کافر چیز ہے کہ بڑے بڑوں کے قدم اکھیڑ دیتی ہے۔ ہر بار جب وہ مجھے نلکے کے پانی کی پیش کش کرتے تھے تو پورا مجمع قہقہوں سے گونج اٹھتا تھا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ پروفیسر صاحب نے جب پھر سے میرے لیے نلکے کا پانی لانے کی پیش کش کی تو میں نے انہیں بازو سے پکڑا اور یہ کہتا ہوا باہر لے آیا کہ مجھے لان میں نصب نلکے کا پانی پسند ہے۔ تشریف لائیے اور پلائیے۔ اور جب لان

میں صرف میں اور پروفیسر صاحب رہ گئے تو میں نے گستاخانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کھڑک کر کہا کہ اگر اب آپ نے نلکے کے پانی کی پیش کش کی تو میں آپ کے دانت توڑ دوں گا! نشے میں دُھت شرابیوں پر اس طرح کی دھمکی کوئی اثر نہیں کرتی مگر پروفیسر ایک دم متاثر ہوگئے اور ایسی چپ سادھ لی کہ فیض صاحب اور سبطِ حسن صاحب کے چھیڑنے پر بھی کچھ نہ بولے۔ دوسرے روز وہ صبح سویرے نسبت روڈ پر میرے غریب خانے میں تشریف لے آئے اور مجھ سے گذشتہ رات کی زیادتی کی معافی مانگی۔ میں نے انہیں سینے سے لگا لیا کہ بنیادی طور پر وہ ایک پیاری شخصیت تھے۔ نہ جانے انہیں یہ کیسے یاد رہ گیا کہ رات انہوں نے غلط حرکت کی تھی۔

میں ۱۹۵۳ء کے آغاز میں روزنامہ ''امروز'' کا مدیر مقرر ہوا اور جب فیض صاحب رِہا ہوئے تو انہوں نے پھر سے ''پاکستان ٹائمز'' کی ایڈیٹری سنبھالی۔ ''امروز'' نے اپنی زندگی کے دس برس پورے کر لیے تھے اس لیے اس کا دہ سالہ نمبر نکالنے کا فیصلہ ہوا۔ اس سلسلے میں فیض صاحب نے اور میں نے ظہیر بابر، حمید اختر، حمید جہلمی اور عبداللہ ملک کے مشوروں سے ایک منصوبہ بنایا اور ایسا یادگار نمبر مرتب کیا کہ بعض باذوق قارئین کے پاس اب تک محفوظ چلا آتا ہے۔

انہی دنوں جب مجھے معلوم ہوا اور فیض صاحب نے خود بھی اعتراف کیا کہ وہ پنجاب کے گورنر میاں مشتاق احمد گورمانی کی تقریریں لکھتے رہے ہیں تو سچی بات ہے، مجھے باقاعدہ صدمہ پہنچا۔ اس سے پہلے انہوں نے برصغیر کی تاریخ کے سفاک ولین، برطانیہ کی فوج میں کرنل کا عہدہ قبول کر کے اپنے چاہنے والوں پر ستم ڈھایا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم ہی تھا کہ فیض صاحب ملک کے حاکم انگریز کی فوج میں بھرتی ہو چکے ہیں مگر مجھے اس وقت شدید صدمہ پہنچا جب میں انہیں فوج کے پتے پر خط لکھنے بیٹھا۔ میں نے ان کا یہ پتہ اپنے نہایت عزیز دوست (اور

ہفت روزہ ''شیرازہ'' کے مدیر) محمد فاضل صاحب سے حاصل کیا تھا۔ فیض صاحب کا پتہ یہ تھا:

کرنل فیض احمد فیض۔ ایم بی ای
ڈپٹی ڈائریکٹر مورال ڈائریکٹوریٹ
جنرل اینڈ جوائنٹ برانچ
جنرل ہیڈکوارٹرز---- نئی دہلی

فیض صاحب کے اس عجیب و غریب پتے نے مجھے دنوں تک اداس رکھا۔ میری وہی کیفیت ہوگئی جو دہلی میں جارج پنجم کے جشن تاجپوشی پر علامہ اقبال کے تہنیتی اشعار پڑھ کر مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر علامہ اقبال اس زمانے کے سب سے بڑے فرنگی کے حق میں وہ اشعار نہ لکھتے اور فیض صاحب ملک کو محکوم رکھنے والے غیر ملکی حکمران کے ساتھ تعاون نہ فرماتے تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑتا!

پھر جب قیامِ پاکستان کے برسوں بعد میں نے اپنی پاکستانی فوج کے ایک بڑے افسر' جنرل کے ایم عارف کے شعری مجموعے کی افتتاحی تقریب کی صدارت کی تھی تو فیض صاحب نے اس پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیوں مناسب سمجھا! جبکہ ادب کا تخلیق کار نہ فوجی ہوتا ہے نہ غیر فوجی---- وہ صرف تخلیق کار ہوتا ہے۔

مگر اس سلسلے میں تنہا فیض صاحب گنہگار نہیں تھے۔ ہمارے بہت سے نامور اہل قلم انگریز کے چکر میں آگئے تھے۔ ن۔م۔راشد تک کیپٹن راشد کہلانے لگے تھے۔ میں اس زمانے میں ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' کا ایڈیٹر تھا۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے مجھے رسالے میں اشاعت کے لیے ایک نظم بھیجی جس کا عنوان تھا ''چند روز اور مری جان''۔ یہ فیض صاحب کی ایک نظم کے ایک مصرع کا ٹکڑا ہے

جسے جوش صاحب نے اپنے مفہوم میں استعمال کیا تھا۔ اس نظم میں فیض صاحب کے علاوہ تاثیر صاحب اور راشد صاحب وغیرہ کو' جو انگریز کی فوج میں بھرتی ہوگئے تھے۔ نشانۂ تضحیک بنایا گیا تھا۔ میں نے یہ نظم پڑھی تو سوچا کہ اگر یہ چھاپ دوں تو میرے یہ سب محترم دوست خفا ہو جائیں گے۔ سو میں نے اس نظم کی نقول تیار کیں اور سب کو بھجوا دیں' کہ اگر آپ اس ضمن میں کچھ کہنا پسند کریں تو میں نظم کے ساتھ انہیں بھی شائع کر دوں گا۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی جواب کی ہمت نہ کی اور یہ نظم میرے دورِ ادارت میں شائع نہ ہو سکی (سنا ہے بعد میں شائع کر دی گئی تھی) نظم کا موضوع یہ تھا کہ شاعر کی بیوی اپنے میاں کو غیرت دلاتی ہے کہ آپ کے سب دوست انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر مزے اڑا رہے ہیں اور :

بیویاں ان کی لونڈر میں بسی رہتی ہیں
شیمپئن پیتی ہیں' صوفوں میں دھنسی رہتی ہیں
ان کی زلفیں ہی نہیں مست و معطر پیارے
ان کے گالوں پہ بھی چربی کے ہیں چکر پیارے

اور شاعر بیوی کو تسلی دیتا ہے کہ :

چند روز اور مری جان' فقط چند ہی روز

نظم کے آخر میں شاعر اپنی بیوی کو سر عبدالقادر کی برپا کی ہوئی ایک دعوت میں شامل ہونے کا کہتا ہے :

اٹھ کھڑی ہو کہ ہے دعوت کا یہ موقع نادر
راستہ دیکھ رہے ہوں گے سر عبدالقادر

اور ''سر عبدالقادر'' پر نشان لگا کر جوش صاحب نے نیچے یہ مختصر نوٹ درج کیا تھا

''اس زمانے میں جب بڑی بڑی شخصیتیں مقامِ اعتبار سے گر رہی ہیں، سر عبدالقادر کی ''عین'' کا گرنا کوئی اتنا بڑا حادثہ نہیں ہے۔''

میں نے بعد میں فیض صاحب کو جوش صاحب کی یہ نظم یاد دلائی مگر وہ طرح دے جاتے رہے اور صرف مسکراتے رہے۔

کبھی کبھی جب کوئی گمبھیر سیاسی مسئلہ درپیش ہوتا تھا اور میاں افتخار الدین بھی ملک سے باہر ہوتے تھے تو فیض صاحب اس مسئلے پر اداریہ لکھنے کے سلسلے میں مجھے مشورہ دینے آتے تھے۔ وہ مسئلے سے متعلق اداریے میں ایک خاص حکمتِ عملی اختیار کرنے کے سلسلے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے تھے مگر اتنا آہستہ بولتے تھے کہ صرف ان کے ہونٹوں کی ہلکی ہلکی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ فیض صاحب ذرا اونچا بولیے۔ وہ دو چار الفاظ اونچے بول کر پھر وہی انداز اختیار کر لیتے تھے۔ میں اداریہ لکھ کر کاتب کے حوالے کر دیتا تھا۔ دوسرے روز فیض صاحب میرا اداریہ پڑھنے کے بعد تشریف لاتے تو شکایت کرتے کہ مسئلے کے بارے میں انہوں نے جو موقف بیان کیا تھا' وہ تو اداریے میں ہے ہی نہیں۔ تب میں عرض کرتا تھا کہ فیض صاحب آپ کا موقف کس کافر کے کانوں تک پہنچا ہے۔ آپ تو ہونٹوں ہونٹوں میں کچھ کہہ جاتے ہیں۔ کچھ پلے پڑتا نہیں اس لیے میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اداریہ لکھ دیتا ہوں۔

فیض صاحب اپنی جگہ پریشان تھے کہ نئے نئے شعرا ان کی شاگردی اختیار کرنے اور ان سے اصلاح لینے آ نکلتے ہیں۔ ادھر میں بھی اسی وجہ سے پریشان تھا چنانچہ جب بھی کوئی نوجوان میرے پاس اس نیت سے آتا تھا' میں

اسے فیض صاحب کے پاس بھیج دیتا تھا کہ وہ مجھ سے سینئر بھی ہیں اور دفتر میں عموماً فارغ ہی بیٹھے ہوتے ہیں کیونکہ سال میں پاکستان ٹائمز کے دوچار ہی ایڈیٹوریل لکھتے ہیں۔ فیض صاحب بھی ان نوجوانوں کو یہ کہتے ہوئے میرے دفتر کا راستہ دکھا دیتے تھے کہ میں تو انگریزی اخبار کا ایڈیٹر ہوں اور انگریزی ہی میں سوچنے لگا ہوں۔ ندیم کے پاس جایئے کہ اُردو اخبار کا ایڈیٹر ہے اور اس لیے اُردو میں سوچتا ہے۔ جب ہم دونوں پر یہ راز کھلا کہ وہ نوجوانوں کو میری طرف اور میں انہیں فیض صاحب کی طرف روانہ کر دیتا ہوں تو ایک روز ہم دونوں نے مل کر ایک تجویز سوچی۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم صاحب تازہ تازہ ریٹائر ہوئے تھے اور سنت نگر میں رہائش پذیر تھے۔ طے پایا کہ شاگردی اور مشورے کے طالبان کو صوفی صاحب کے ہاں بھجوایا جانا شروع کر دیا جائے' چنانچہ ضرورت مندوں کو ہم نے صوفی صاحب کے گھر کا راستہ دکھانا شروع کر دیا۔ تین چار ماہ کے بعد ایک بار ہم دونوں کسی تقریب میں شامل ہونے پہنچے تو صوفی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سلام و آداب کے بعد میں نے پوچھا کہ قبلہ ریٹائرمنٹ کے بعد کا وقت کیسا گزر رہا ہے؟ بولے ''ویسے تو کچھ ادھورے ادبی کام مکمل کرنے کا وقت مل گیا ہے مگر ایک پریشانی بہت شدید ہے۔ نوجوان اپنی کچی پکی غزلیں لے کر میرے پاس قطار اندر قطار آنے لگے ہیں اور ایک پل بھی چین نہیں لینے دیتے۔'' فیض صاحب کو تو صوفی صاحب کے یہ الفاظ سن کر بے تحاشہ ہنسی آ گئی اور وہ قہقہے لگاتے بلکہ قہقہوں پر قابو پانے کی کوشش میں پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دور چلے گئے مگر میں چند لمحے ضبط کیے کھڑا رہا۔ پھر فیض صاحب کو ہنسی سے بے چین دیکھ کر میں بھی خود پر قابو نہ رکھ سکا اور ہنسنے لگا۔ صوفی صاحب پریشان ہو کر کبھی دور جاتے فیض صاحب کو دیکھتے تھے' کبھی مجھے گھورتے تھے اور آخر فرمایا ''کیوں بھئی کیا بات ہے؟ کیا میں نے تمہیں کوئی لطیفہ سنایا ہے کہ کھی کھی کیے جا رہے

ہو؟'' تب تک فیض صاحب بھی واپس آ گئے تھے اور میں نے بھی ضبط کر لیا تھا اور جب ہم نے صوفی صاحب کو بتایا کہ ہم ہی یہ افواجِ قاہرہ آپ کی طرف بھیجتے ہیں۔ تو اب ہم تینوں میں طے پایا کہ ان نوجوانوں کو عابد علی عابد صاحب کے گھر کا پتہ بتا کر کہنا چاہیے کہ وہ بالکل فارغ ہیں' ان کے پاس مشورہ دینے کا وافر وقت ہے۔ اب اس کے بعد عابد صاحب پر کیا گزری---- یہ الگ قصہ ہے۔

اُن دنوں روز نامہ ''امروز'' کراچی سے بھی نکلتا تھا مگر اس کی سرکولیشن آٹھ دس ہزار سے آگے بڑھتی ہی نہیں تھی۔ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کو اس کی وجہ سے خاصا نقصان برداشت کرنا پڑ رہا تھا اس لیے میاں افتخار الدین صاحب اور سید امیر حسین شاہ صاحب (مینجنگ ڈائریکٹر) نے فیض صاحب کو اور مجھے ''امروز'' کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے کراچی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ دفتر کی طرف سے ہم دونوں کے لیے ریلوے کی فرسٹ کلاس ایئر کنڈیشنڈ سیٹیں بک ہو گئیں۔ فیض صاحب نے تو خیر اس طرح کے کئی سفر کیے ہوں گے مگر ایئر کنڈیشنڈ ڈبے میں سفر کرنے کا میرا پہلا تجربہ تھا۔ جب ہم اپنے ڈبے میں پہنچے تو دیکھا کہ اس میں دو سیٹیں آمنے سامنے کی ہیں اور دو اوپر کی ہیں۔ سامنے کے نیچے اور اوپر کی سیٹ فلمی دنیا کے دو مشہور اصحاب' آغا گل صاحب اور چوہدری عید محمد صاحب کے لیے بک تھیں اور دو ہم دونوں کے لیے۔ رات کا وقت تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سونے سے کچھ دیر پہلے ہم چاروں اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے جب ڈبے کا دروازہ کھلا اور ملک فیروز خاں نون اندر تشریف لائے۔ وہ آتے ہی فیض صاحب سے ''فیضی فیضی'' کہتے ہوئے لپٹ گئے اور بولے ''مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا کہ تم بھی اسی ٹرین میں کراچی جا رہے ہو۔ مجھے پہلے معلوم ہوتا تو تمہارے ساتھ کی سیٹ بک کرا لیتا مگر بہرحال یہی بہت ہے کہ ہم دونوں ہمسفر تو

ہیں۔ اور ہاں فیض ایک محفل میں تمہاری تازہ غزل کے تین شعر تمہارے ایک عقیدت مند نے سنائے تو لطف آ گیا۔ میں نے یہ تینوں شعر نوٹ کر لیے۔ اب بھی میری جیب میں ہیں۔" یہ کہہ کر ملک صاحب نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور فیض صاحب کو ان کے شعر سنانے لگے۔ انہوں نے تینوں کے تینوں شعر غلط پڑھے۔ پھر جب وہ کاغذ تہہ کر کے اور اسے کوٹ کی جیب میں منتقل کر کے چلے گئے تو میں نے فیض صاحب سے عرض کیا "اس دنیا میں آپ کا کیسا کیسا عقیدت مند موجود ہے فیض صاحب!" وہ میرے طنز کو سمجھ گئے اور بولے "ہمارے سیاست دان شعر کے معاملے میں عموماً جاہل ہوتے ہیں۔"

اب سونے کا وقت آیا تو فیض صاحب نے نیچے کی برتھ پسند کی اور میں نے اوپر کی۔ شدید گرمی کے موسم میں ڈبے کی یخ فضا باقی تنیوں کے لیے تو معمول کا درجہ رکھتی تھی مگر میرے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھی۔ میں اوپر کی سیٹ پر ایک آسودگی کے احساس کے ساتھ لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ سو بھی گیا مگر زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ میں سردی سے کانپنے لگا۔ نیچے جھانکا تو فیض صاحب بیڈ لائٹ جلائے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا "فیض صاحب مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔ اوڑھنے کے لیے کوئی موٹا کپڑا ہوگا آپ کے پاس؟" فیض صاحب مسکراتے ہوئے اٹھے اور اپنی اٹیچی میں سے ایک بڑا سا تولیہ نکال کر مجھے دیا اور ساتھ ہی فرمایا۔ "وہ ضرب المثل تو آپ نے ضرور سنی ہوگی۔ وہی کہ--- گھی ہضم نہیں ہوتا!" اس پر ہم دونوں نے قہقہہ لگایا تو دونوں فلمی شخصیتوں نے جیسے ڈسٹرب ہو کر کروٹ بدلی۔

میں یہ بڑا سا تولیہ اوڑھ کر سو گیا مگر آدھ پون گھنٹے کے بعد آنکھ کھل گئی۔ شدید ٹھنڈک تولیے کو پار کر کے میری ہڈیوں تک میں اتری جا رہی تھی۔ گھبرا کر میں نے نیچے والی سیٹ، پر فیض صاحب کو دیکھا تو وہ اپنے گھٹنے سینے سے

لگائے ایک گٹھڑی سی بنے پڑے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا "فیض صاحب!" ان کی آواز آئی۔ "جی۔" اور میں نے عرض کیا۔ "ہاضمہ آپ کا بھی خراب ہی معلوم ہوتا ہے۔" اس پر ہم دونوں اس زور سے ہنسے کہ آغا گل صاحب اور عید محمد صاحب بیدار ہو گئے اور ہم سے ہمارے قہقہوں کا سبب پوچھا۔ اور جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم دونوں سردی سے کپکپا رہے ہیں اور اس کپکپی کو قہقہوں سے ڈھانپنے کی کوشش کر رہے ہیں، تو وہ بہت محظوظ ہوئے۔ مگر وہ آئے دن لاہور سے کراچی کا ایئر کنڈیشنڈ سفر کرتے رہتے تھے اس لیے دونوں کے پاس فالتو کمبل بھی تھے، سو دونوں نے ایک ایک کمبل ہمارے حوالے کیا اور تب ہم سکون سے سو سکے۔

ان دنوں ملک کے مشہور ماہر موسیقی رفیق غزنوی کراچی ہی میں مقیم تھے۔ انہوں نے فیض صاحب کی اور میری آمد کا سنا تو ہمیں اپنے گھر لے آئے۔ وہ ادھیڑ عمر میں بھی ایک خوبصورت انسان تھے مگر جب انہوں نے اپنی نئی بیوی سے ہمیں متعارف کرایا تو مجھے افسوس سا ہوا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بیس بائیس برس کی لڑکی لگتی تھیں اور رفیق صاحب اِن سے تیس پینتیس برس بڑے ہوں گے، مگر بہرحال یہ ان کا سراسر ذاتی مسئلہ تھا۔

رفیق صاحب نے بیئر سے فیض صاحب کی مدارت شروع کی۔ گلاس میرے سامنے بھی رکھا مگر فیض صاحب نے میری مدد کی اور رفیق صاحب کو مطلع کیا کہ "یہ نہیں پیتے۔"

"کیا آپ بیئر جیسی غیر نشہ آور چیز بھی نہیں پیتے؟" رفیق صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ تو ایسی ہی ہے جیسے آپ سڑک کنارے گنے کے رس کا ایک گلاس پی لیں۔"

میں نے کہا "مگر میرے اور آپ کے دوست سعادت حسن منٹو نے تو

بیئر کے سلسلے میں آپ کے متعلق کچھ اور بتایا تھا۔''

رفیق صاحب بولے''کیا بکواس کی تھی اس کشمیریے نے؟''

میں نے کہا''منٹو کہتے تھے کہ رفیق غزنوی کا سا مضبوط جثے کا آدمی بھی بیئر کی دو بوتلیں پی لیتا ہے تو اس سے ایک خاص لفظ ٹھیک سے نہیں بولا جاتا---- اس کی زبان لڑکھڑا جاتی ہے۔ اسے نشہ ہو جاتا ہے۔''

رفیق صاحب نے ہنستے ہوئے کہا''میں نے بتایا تھا نا کہ منٹو فضول بک بک بہت کرتا تھا۔ اس نے آپ کو کون سا لفظ بتایا تھا۔''

فیض صاحب نے مجھے مخاطب کیا''رفیق دو بوتل بیئر چڑھا لے تو پھر بتایئے گا۔''

فیض صاحب تو جیسے تاک میں تھے۔ جب رفیق صاحب نے دوسری بوتل کا آخری گھونٹ بھی پی لیا تو فیض صاحب بولے''اب بتایئے منٹو نے کس لفظ کی بات کی تھی۔''

رفیق صاحب نے بھی کہا''جی ہاں دو بوتلیں تو میں نے پی لیں۔ اب بتایئے وہ کون سا لفظ ہے جو میں ٹھیک سے نہیں بول سکوں گا۔''

میں نے کہا''ذرا بول کر دکھایئے''ٹمبکٹو بولیے۔''

رفیق صاحب بولے''ٹکٹمبو''!

فیض صاحب نے زور کا ایک قہقہہ لگایا۔

میں نے کہا''ٹمبکٹو۔ ٹمبکٹو بولیے۔''

رفیق صاحب نے کہا۔''بول تو رہا ہوں۔ ٹکٹمبو---ٹکٹمبو---''

فیض صاحب کا ہنستے ہنستے بڑا حال ہوگیا مگر رفیق صاحب کہتے رہے۔ ''ہنس کیوں رہے ہیں فیض صاحب؟ کہہ تو رہا ہوں۔ ٹکٹمبو---ٹکٹمبو--- منٹو شرارت کرتا تھا۔''

اور فیض صاحب نے ہنستے ہوئے کہا ''منٹو یقیناً شرارت ہی کرتا تھا۔ اس کا ثبوت مل گیا ہے۔''

جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت میں فیض صاحب لاہور آرٹس کونسل کے سیکرٹری (یا ریذیڈنٹ ڈائریکٹر) تھے۔ ایک روز میں کسی کام سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر راوی روڈ پر چغتائی صاحب کے ہاں لے چلے۔ نسبت روڈ پر سے گزرے تو انہیں سڑک کے کنارے ''قاسمی پریس'' کا ایک بڑا سا بورڈ دکھائی دیا۔ مجھے معلوم نہیں یہ کن صاحب کا پریس تھا مگر بہرحال قاسمی پریس کا بورڈ موجود تھا۔ فیض صاحب کہنے لگے ''آپ چپکے چپکے اتنا بڑا کاروبار چلا رہے ہیں؟'' اس پر ہم دونوں ہنسے۔ تھوڑا آگے گئے تو میوہسپتال کے قریب مجھے ایک بورڈ دکھائی دیا۔ میں نے کہا ''فیض صاحب کاروبار آپ نے بھی بہت پھیلا رکھا ہے۔ وہ بورڈ دیکھیے۔'' بورڈ پر ''فیض ہیئر کٹنگ سیلون'' کے الفاظ درج تھے۔ فیض صاحب اتنا ہنسے کہ انہیں کار سڑک کے ایک طرف روک لینا پڑی۔

ہم دونوں کے درمیان اس طرح کی بے ضرر چھیڑ چھاڑ جاری رہتی تھی۔ ایک روز میں لاہور آرٹس کونسل میں ان کے پاس گیا تو وہ بولے ''چلیے جا کر کافی پیتے ہیں۔'' باہر جا کر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس زمانے میں مال روڈ وغیرہ پر ٹریفک سگنل نہیں نصب ہوئے تھے بلکہ چوکوں میں پولیس کے سپاہی ٹریفک کنٹرول کرتے تھے اور پیدل چلنے والوں کے لیے دونوں طرف دو دو تین تین فٹ اونچے سیمنٹ کے کھمبے سے رکھے ہوئے تھے۔ فیض صاحب کی ڈرائیونگ کا معیار ہم سب دوستوں کا خاص موضوع تھا.. میں نے کہا ''فیض صاحب احتیاط کیجئے گا۔ گاڑی ان کھمبوں میں نہ دے ماریے گا۔'' فیض صاحب بولے ''آپ لوگوں نے میری ڈرائیونگ کے بارے میں غلط----'' اور انہوں نے گاڑی سیدھ

سے سیمنٹ کے کھمبے میں دے ماری۔ ہنسنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کی۔ فیض صاحب نے گاڑی وہیں چھوڑی اور فیروز سنز میں آ کر اپنے دفتر فون کیا کہ ڈرائیور آئے اور ہماری گاڑی لے جائے۔

ہم لوگوں نے فیض صاحب کی ڈرائیونگ کے بارے میں یہ تک مشہور کر رکھا تھا کہ وہ کار کو روکنا جانتے ہی نہیں اس لیے انہوں نے پٹرول کا ایک خاص پیمانہ مقرر کر رکھا ہے چنانچہ اس پیمانے کے مطابق پٹرول پاکستان ٹائمنر کے دفتر کے سامنے ختم ہو جاتا ہے اور گاڑی خود بخود رک جاتی ہے۔

اور یہ تو خیر واقعہ ہے کہ میں بھی فیض صاحب کی گاڑی میں موجود تھا۔ دو اور لوگ بھی تھے۔ اب یاد نہیں کہ کون کون تھے۔ بہرحال گاڑی پاکستان ٹائمنر کے دفتر کی طرف جا رہی تھی۔ فیض صاحب نے ایک مقام پر گاڑی کا گیئر بدلا۔ ٹھیک اسی وقت قریب سے گزرنے والے ایک ٹرک میں بھی گیئر بدلا گیا جس میں سے گھرر کی ایک خوفناک آواز آئی۔ فیض صاحب سمجھے یہ آواز ان کی گاڑی کے گیئر سے آ رہی ہے چنانچہ بریک لگائی اور بولے ''لو بھئی قصہ تو ختم ہو گیا۔ گیئر ٹوٹ گیا ہے۔'' تب ہم نے عرض کی کہ یہ آواز ٹرک کے گیئر کی تھی، آپ کی کار کے گیئر کی نہیں تھی اور پھر سب مسافر جی کھول کر ہنسے۔

لائل پور کاٹن ملز، دلی کلاتھ ملز کا ذیلی ادارہ تھا جہاں ہر سال پاکستان و ہند کے منتخب شعرا جمع ہوتے تھے اور دو مشاعرے منعقد ہوتے تھے---- ایک خاص مشاعرہ---- دوسرا عام مشاعرہ---- ان مشاعروں میں شعرا کو نقد معاوضے کے علاوہ کاٹن ملز کی بعض مصنوعات کا بنڈل بھی پیش کیا جاتا تھا اور جب شعرا صبح کو واپس جانے کے لیے سڑکوں پر نکلتے تھے تو انگلیاں اٹھتی تھیں اور تضحیک کے انداز میں کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ طے کیا گیا کہ مل کے منتظمین سے کہا جائے کہ وہ کپڑے کے بنڈل دینے کی بجائے ہر شاعر

کے معاوضے میں کچھ اضافہ کر دیا کریں کیونکہ یہ بنڈل تو شعرا کی بدنامی کا باعث ہو رہے ہیں۔ منتظمین مان گئے۔ اگلے سال شعرا ان بنڈلوں سے محفوظ رہے۔

لائل پور سے واپسی پر میں ''امروز'' کے دفتر میں بیٹھا تھا جب بیگم ایلس فیض تشریف لائیں اور مجھ سے پوچھا کہ تمہیں لائل پور میں کیا معاوضہ ملا میں نے رقم بتائی تو وہ بولیں ''اور کپڑوں کا بنڈل؟'' میں نے عرض کیا کہ ہم شعرا نے یہ سلسلہ رکوا دیا اس پر وہ مسکرائیں اور بولیں ''اچھا تو فیض نے تمہیں بھی سمجھا بجھا دیا ہے!'' اور تشریف لے گئیں۔ اور میں سوچتا رہا کہ بیوی چاہے پاکستان کی ہو چاہے انگلستان کی' آخر گھر کی مالکن ہوتی ہے اس لیے اسے بستر کی چادروں' میز پوشوں اور تولیوں وغیرہ کی ضرورت تو رہتی ہی ہے۔

اسی طرح کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے فیض صاحب اور میں لائل پور براستہ جڑانوالہ جا رہے تھے جب لائل پور سے چند میل ادھر ہی ہم نے دیکھا کہ سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ ڈرائیور گھبرایا کہ شاید ڈاکے کا معاملہ ہے مگر میں نے یہ کہہ کر اسے بے فکر کر دیا کہ شعرا پر ڈاکہ صرف اس وقت نتیجہ خیز ہوتا ہے جب وہ مشاعرے سے واپس آ رہے ہوں۔ اس لیے یہ رکاوٹ کسی اور بات کا شاخسانہ ہے۔

جب ہماری کار رکاوٹ کے پاس رکی تو قریب کی ایک سِلک ملز کے گیٹ میں سے بہت سے لوگ ہنستے ہوئے نکلے' بڑے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا اور بتایا کہ انہیں ہمارے یہاں سے گزرنے کا علم تھا اس لیے انہوں نے ہمیں یہاں روکنے کے لیے سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔ انہوں نے ہماری خاطر ایک ٹی پارٹی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ انہوں نے کہا ''چائے پیجیے' اندر سے مل دیکھیے اور پھر بخوشی لائل پور تشریف لے جایئے۔''

تیس چالیس حضرات کے ہجوم میں ہم نے پرتکلف چائے پی۔ پھر مل

مالک ہمیں مل کے اندر لے گئے۔ ریشمی کپڑا تیار ہو رہا تھا اور مشینوں میں سے یوں نکل رہا تھا جیسے آبشار گر رہا ہے۔ اس معائنے سے محظوظ ہونے کے بعد ہمیں اس سے ''مستفید'' ہونے کا انتظار رہا کہ مل مالک سلک کا ایک ایک تھان تو ضرور ہماری نذر کریں گے مگر انہوں نے صرف خدا حافظ کہنے پر اکتفا کیا۔ مجھ سے کہا کہ آپ ''امروز'' میں ''حرف و حکایت'' کا کالم لکھتے ہیں' اب کے ہم غریبوں کے بارے میں بھی کچھ لکھ ڈالیے گا۔

میں نے پوچھا ''آپ غریب کیسے ہو گئے محترم؟''

وہ بولے ''دیکھیے نا اسی لائل پور میں ایک کاٹن مل ایسی بھی ہے جس کا مالک ایک لاکھ روپیہ روزانہ منافع کماتا ہے۔ ہم اپنی اس مل سے صرف تیس پینتیس ہزار روزانہ کما پاتے ہیں' اس صورت میں ہم غریب نہیں ہیں تو اور کیا ہیں۔''

میں نے کہا ''اس صورت میں تو آپ صرف غریب ہی نہیں' کنگلے قلاش ہیں۔ میں واپس جا کر آپ کے ارشادات کی روشنی میں ایسا کالم لکھوں گا کہ آپ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔''

میں نے موعودہ کالم لکھا اور پھر مل مالک صاحب سے زندگی بھر ملاقات نہیں ہو سکی۔ میں نے ملاقات کی گنجائش ہی ختم کر دی تھی۔

میرے ایک مضمون میں گورے ملکوں کے حکمرانوں کی بجائے گوروں کی مذمت کی گئی تھی۔ فیض صاحب نے نہایت دلداری سے مجھے ٹوکا کہ سب گورے برے نہیں ہوتے' ان کے حکمران برے ہیں' جیسے ہم لوگ خراب نہیں مگر ہمارے حکمران بہت خراب ہیں۔ میں نے آئندہ محتاط رہنے کا وعدہ کیا۔

ایک روز میں نے فیض صاحب سے کہا کہ لاہور کے ایک روزنامے میں ہر ہفتے ایک صاحب آپ کے خلاف قطعہ لکھتے ہیں۔ آپ کے اتنے بے شمار

عقیدت مند ہیں کسی سے کہیے کہ وہ ان قطعات کے خلاف کسی اخبار میں جوابی قطعات لکھ دیا کرے۔ فیض صاحب بولے "چھوڑیے اسے لوہاروں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔" میں فیض صاحب کے منہ سے یہ الفاظ سن کر حیران رہ گیا۔ میں نے عرض کیا۔ "فیض صاحب یہ آپ نے کیا فرمایا؟ لوہار تو مزدور ہوتے ہیں اور ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق ہر لحاظ سے محترم ہوتے ہیں آپ نے ان کا ذکر بڑے معنوں میں کیوں کیا؟" فوراً بولے "غصے میں ایسا کہہ گیا ورنہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ سب کامی لوگ ہم سب کے احترام کے مستحق ہوتے ہیں۔"

۱۹۵۶ء میں فیض صاحب اور میں روزناموں کے سولہ مدیران کے اس وفد میں شامل تھے جسے پاکستان کے وزیراعظم کے ہمراہ چین کا دورہ کرنا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار ہم اسی دورے کے سلسلے میں لاہور سے کراچی پہنچ گئے تھے مگر وہاں معلوم ہوا تھا کہ وزیراعظم صاحب نے چین کا دورہ منسوخ کر دیا ہے۔ اب کے ہم لاہور سے کراچی اور کراچی سے عازم ہانگ کانگ ہوگئے۔

کے ایل ایم کا بڑا طیارہ تھا اور میں پہلی بار طیارے میں سوار ہوا تھا۔ خلیج بنگال پر طیارہ ایک طوفان میں گھر گیا۔ کبھی نیچے جاتا تھا کبھی اوپر۔ بلندی پر جاتے ہی پھر سے نیچے چلا جاتا تھا۔ شدید جھٹکے لگ رہے تھے۔ ہمارے عقب میں دو تین پاکستانی ڈیلیگیٹ لفافوں میں قے فرما رہے تھے۔ مولانا اختر علی خان بلند آواز میں آیت الکرسی کا ورد کرنے لگے تھے۔ فیض صاحب میرے پہلو کی سیٹ پر سو رہے تھے۔ میں نے خوفزدگی میں انہیں پکارا "فیض صاحب---- فیض صاحب یہ جہاز کو کیا ہو رہا ہے۔" آنکھیں نیم وا کر کے خوابیدہ آواز میں بولے "ہوتا رہتا ہے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے سو جایئے!" اور وہ سو گئے مگر اپنی تو نیند حرام ہو چکی تھی۔ خدا خدا کر کے طوفان تھما۔ طیارہ خلیج بنگال طے کر کے جنوب

مشرقی ایشیا کے سبزہ زاروں پر سکون سے اڑتا جا رہا تھا۔

طیارہ بنکاک میں اترا۔ وہاں ''کے۔ایل۔ایم'' والوں نے ہمیں ایک کار دی کہ ہانگ کانگ جانے میں ابھی بہت وقت ہے۔ شہر کی سیر کر آؤ۔ فیض صاحب' مولانا اختر علی خان اور مَیں بنکاک کی مختلف سڑکوں پر گھوم پھر کر ایک ریستوران میں آئے اور کافی کا آرڈر دیا۔ مولانا اختر علی خان نے ایئرپورٹ پر ہی روپوں کے بدلے تھائی لینڈ کے کرنسی نوٹ حاصل کر لیے تھے۔ انہوں نے کافی کا بل ادا کرتے ہوئے ایک نوٹ دیا۔ جب بیرا باقی رقم واپس لایا تو مولانا نے ''ٹپ'' کہہ کر بقایا واپس کر دیا۔ بیرا بار بار رکوع کی حالت میں جھک جھک گیا۔ ہم باہر گاڑی میں آ کر بیٹھے تو تب بھی یہ بیرا رکوع پر رکوع کر رہا تھا۔ مولانا نے کہا ''اِدھر کے لوگ کتنے مودب ہوتے ہیں۔ پاکستان میں تو ٹپ دو تو بیرے یوں لیتے ہیں جیسے یہ ان کا پیدائشی حق تھا۔'' بعد میں ایئرپورٹ پر جا کر معلوم ہوا کہ مولانا نے ہوشربا رقم ٹپ میں دے ڈالی تھی۔ مثال کے طور پر اگر بل پانچ روپے کا تھا تو مولانا نے ایک سو کا نوٹ بیرے کو دے دیا تھا اور پچانوے روپے اسے ٹپ کر دیے تھے۔ تب مولانا نے فرمایا ''میں نے بھی کہا' اس بیرے کو کیا ہوگیا ہے کہ اس کے رکوع ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہے ہیں۔''

طیارہ ہانگ کانگ کے ایئرپورٹ پر اتر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ نیچے عین مین وہی منظر تھا جو میرے دیہاتی دوست محمد سعید نے کھینچا تھا۔ وہ پولیس میں بھرتی ہو کر ہانگ کانگ گیا تھا اور جنگ چھڑنے پر جاپان کا قیدی ہوگیا تھا۔ رہائی کے بعد وہ گاؤں آیا تو میں نے اس سے اس کے تجربات و مشاہدات کا پوچھا۔ اس نے ہانگ کانگ اور کولون کا جو نقشہ کھینچا تھا' وہی نقشہ میرے سامنے تھا۔ میں محمد سعید کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا کہ اسی کی بتائی ہوئی تفصیلات سے کام لے کر میں نے اپنا افسانہ ''مامتا'' لکھا تھا جس کا پس منظر یہی ہانگ کانگ اور

ملحقہ سمندر میں چھوٹے چھوٹے جزائر ہیں۔

ہانگ کانگ ہوٹل میں ایک چینی ٹیلر آیا۔ سوٹ کے کپڑے کے کئی نمونے اس کے پاس تھے اور اس کا وعدہ تھا کہ اب آرڈر دیجئے اور شام تک سلا سلایا سوٹ لے لیجئے۔ میں نے براؤن رنگ اور فیض صاحب نے سفید رنگ کا کپڑا پسند کیا اور شام کو اسی کپڑے کے سلے سلائے اور بالکل فٹ سوٹ ہمیں مل گئے۔

دوسرے روز ہم سب مدیرانِ جرائد ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ناشتے کے لیے اکٹھے ہوئے تو فیض صاحب وہی سفید سوٹ پہنے تشریف لائے۔ مگر وہاں ایک لطیفہ ہوگیا۔ ہوٹل کے بیروں نے بھی سفید سوٹ ہی پہن رکھے تھے۔ میں نے کہا ''فیض صاحب جلدی سے سوٹ بدل آیئے ورنہ کوئی گاہک آپ کو بلا کر کوئی آرڈر دے ڈالے گا۔'' فیض صاحب نے دائیں بائیں سب بیروں کو سفید سوٹ ہی میں ملبوس دیکھا تو پریشان ہوگئے۔ پھر دس پندرہ منٹ کے بعد دوسرا سوٹ پہنے واپس آگئے۔ اس کے بعد میں نے انہیں لاہور میں اس سفید سوٹ میں ملبوس نہیں دیکھا۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے انہوں نے یہ سوٹ سمندر میں پھینک دیا ہوگا۔

میں ہانگ کانگ ہوٹل میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے کھڑکی میں سے سمندر کا نظارہ کر رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک مسکراتا ہوا چینی اندر آیا اور ننگی چینی لڑکیوں کا ایک البم میرے سامنے پھیلا دیا اور بولا ''آپ جس تصویر پر ہاتھ رکھیں گے وہی لڑکی چند منٹ میں حاضر ہو جائے گی۔'' میں تو کانپ گیا۔ مجھے کوئی راہِ فرار نہ سوجھی تو میں نے کہا کہ ہمیں اپنے لیڈر آف ڈیلیگیشن سے اجازت لینا ضروری ہے۔ وہ فلاں نمبر کمرے میں ہیں۔ پہلے ان کے پاس جاؤ۔ وہ شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ آٹھ دس

منٹ بعد فیض صاحب کا فون آیا کہ کیا اس ایلیم بردار کو آپ نے ہماری طرف بھیجا تھا؟ میں نے کہا ''فیض صاحب میرا تو اپنے ملک سے نکلنے کا پہلا تجربہ ہے اور آپ نے تو پورا کرۂ ارض چھان رکھا ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ ان بدمعاشوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔ میں نے اسے آپ کے پاس بھیج دیا کہ آپ اسے مناسب الفاظ میں ڈانٹ دیں گے۔'' فیض صاحب بولے ''مطمئن رہیے۔ ہم نے ڈانٹ دیا ہے۔''

دوسرے روز شام کے قریب فیض صاحب میرے کمرے میں آئے اور بولے۔ ''چلیے ذرا ساحلِ سمندر تک گھوم آئیں۔'' میں نے کہا ''سبحان اللہ میرا بھی یہی جی چاہ رہا تھا۔'' ہم ایک دو سڑکیں طے کر کے ساحل پر پہنچے تو ساحل کی مضبوط ریلنگ پر یہاں سے وہاں تک سولہ سولہ سترہ سترہ سال کے لڑکے اونچی نیکریں پہنے ہوئے مختلف زاویوں سے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور ہنس کھیل رہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ اتنے بہت کم لباس لڑکے یہاں کیوں جمع ہیں جب ہانگ کانگ پولیس کا ایک سپاہی جو پنجاب سے تعلق رکھتا تھا' ہمارے پاس آیا اور اُردو میں پوچھا ''آپ وہی پاکستانی تو نہیں ہیں جو چین جا رہے ہیں اور کل ہی یہاں پہنچے ہیں؟'' ہم نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولا ''آپ یہاں کیوں آ نکلے ہیں۔ یہ تو لونڈے طوائفوں کا مرکز ہے۔ یہاں سے نکل جایئے ورنہ ابھی کوئی فوٹوگرافر آ کر آپ کی تصویر اتار لے گا اور اخبار میں اس کیپشن کے ساتھ چھاپ دے گا---- ''پاکستانی ایڈیٹر ہانگ کانگ کے لونڈا بازار میں۔'' ہم یہ سن کر بھاگے تو نہیں مگر اس تیزی سے واپس آئے جیسے ہمارے پاؤں میں پر لگ گئے ہیں۔ ایک محفوظ مقام پر پہنچ کر ہم سانس لینے کے لیے رکے اور پھر خوب جی کھول کر ہنسے کہ اگر یہ پاکستانی نوجوان ہماری مدد کو نہ آتا تو ہمارا کیا بنتا!

دوسرے روز ہمیں چین میں داخل ہونا تھا مگر ہانگ کانگ کے پاکستانیوں میں سے ایک صاحب ہمارے پاس آئے اور چپکے سے بتایا کہ آپ کے وزیراعظم کا دورۂ چین ایک بار پھر منسوخ ہوگیا ہے۔ دراصل ہمارے وزیراعظم صاحب اس خطرے کے تحت کرسی چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے کہ ان کی غیرحاضری میں یہاں کوئی اور نہ آ کر بیٹھ جائے! فیض صاحب نے وفد کے سولہ افراد کو ایک کمرے میں اکٹھا کر کے انہیں چپکے سے بتایا کہ ہمارے وزیراعظم صاحب نے دورہ پھر منسوخ کر دیا ہے اور اگر ہمارے چینی میزبانوں کو اس کا پتہ چل گیا تو ہمیں ہانگ کانگ سے واپس کراچی پرواز کر جانا پڑے گا۔ایک بار ہم چین میں داخل ہو جائیں۔ پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔سب نے خاموش رہنے کی ہامی بھری اور ہم لوگ اپنے دو چینی ترجمان میزبانوں کے ہمراہ ریل گاڑی سے کینٹن روانہ ہوگئے۔

کراچی میں مجید ملک صاحب نے فیض صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ چین میں جو چاہے کھانا پینا مگر چین کی خاص شراب ''موتائی'' کو چھونا بھی نہیں کیونکہ جو اس شراب کے عادی نہیں ہوتے وہ پیتے ہیں تو ہوسکتا ہے' موتائی کی وجہ سے انہیں موت ہی جائے۔ موتائی دراصل ''موت آئی'' ہے۔ خبردار رہنا۔''

اب ہم کینٹن کے ایک ہوٹل میں پہنچے تو میزبانوں میں سے ایک نے ہمارے لیڈر آف ڈیلیگیشن فیض صاحب سے شاید کافی یا چائے وغیرہ کے حوالے سے پوچھا ''آپ کیا پینا پسند کریں گے؟'' فیض صاحب بولے ''موتائی پلا دیجئے!'' میں نے گھبرا کر فیض صاحب کی طرف دیکھا مگر ہجوم میں کچھ کہہ نہ سکا۔ فیض صاحب نے موتائی کے دو تین پیگ چڑھا لیے۔ مگر مجال ہے جو ان کی پیشانی پر ایک شکن بھی نمودار ہوئی ہو۔

تب ایک چینی ترجمان اٹھا اور بولا ''حضرات ہمیں بڑا افسوس ہے کہ

آپ کے وزیرِاعظم نے اپنا دورہ منسوخ کر دیا ہے۔ اس کا ہمیں ہانگ کانگ ہی میں علم ہوگیا تھا مگر آپ سے ذکر نہیں کیا کہ آپ پریشان ہوں گے۔ آپ کے وزیرِاعظم آتے تو آپ عوامی چین کی حکومت کے مہمان ہوتے۔ مگر اب آپ کل چائنا جرنلسٹس یونین کے مہمان ہیں اور ہم آپ کو پورے چین کا دورہ کرائیں گے۔'' ڈھیلی ڈھیلی تالیاں بجیں کیونکہ ہم سب اندر سے شرمندہ تھے کہ ہم جس خبر کو چھپائے ہوئے تھے' اس سے ہمارے میزبان بہت پہلے سے باخبر تھے!

چین کی جرنلسٹ یونین نے ہمیں چین کے جنوب سے شمال تک اور مشرق سے مغرب تک کا دورہ کرایا۔ جب بھی ہم لوگ کسی شہر میں پہنچتے' ہمارے استقبال کو وہاں کے جرنلسٹ موجود ہوتے۔ ہر شہر میں فیض صاحب ہم سب کا تعارف کراتے۔ دورے کے آخری دن تک میری باری آئی تو میرا نام بتانے کے بعد فیض صاحب یہ کہتے:

(He is the editor of a vernacular dialy "Imroze" which means "today".)

ایک دو بار جی چاہا' فیض صاحب سے کہوں کہ ٹھیک ہے۔ میں روزناموں کے ایڈیٹروں کے وفد کا رکن ہوں مگر شاعر اور افسانہ نگار بھی تو ہوں۔ میرا تعارف کراتے ہوئے ایڈیٹری کے ساتھ ہی میری شاعری' افسانہ نگاری کا بھی ذکر کر دیجئے گا تو کیا کسی گناہ کا ارتکاب ہو جائے گا' جبکہ آپ خاص طور پر مشرقی پاکستان کے ایڈیٹروں کی جرنلزم کے علاوہ ان کے مصوری موسیقی وغیرہ کے شوق کا بھی ذکر فرما دیتے ہیں۔ مگر میں ایسا کہہ نہ سکا کہ شاید مناسب نہ تھا۔

چین کے دورے کے آخری روز فیض صاحب نے پورے وفد کو اپنے کمرے میں جمع کیا اور انہیں بتایا کہ ''میری اطلاع کے مطابق آل چائنا جرنلسٹس یونین الوداعی پارٹی میں ہم سب کو بہت سے تحفے دے گی۔ ہم نے دور اندیشی

سے کام نہیں لیا اور پاکستان کا ایک بھی تحفہ ساتھ نہیں لائے۔ اب یہی ممکن ہے کہ آپ لوگوں کے پاس اگر کوئی ایسی چیز ہے جو بطور تحفہ چینی دوستوں کو پیش کی جا سکے تو لائیے تاکہ دعوت میں ہماری شرمندگی ذرا سی تو کم ہو سکے۔''

وفد کے ہر رکن نے کوئی نہ کوئی چیز پیش کر دی۔ مشرقی پاکستان کے ایڈیٹر صاحبان ہم سے زیادہ باخبر نکلے کہ وہ اپنے ہمراہ بطور خاص تحائف لائے تھے۔ ان کے پاس بانس کی بنی ہوئی نازک نازک چیزیں خاصی تعداد میں تھیں۔ وہ جمع ہوگئیں۔ میرے پاس میرے پہلے مجموعۂ کلام ''جلال و جمال'' کا وہ نسخہ تھا جس کی طباعت مثالی تھی اور جس کا دیدہ زیب سرورق محترم عبدالرحمٰن چغتائی نے بنایا تھا۔ میں یہ کتاب پیکنگ یونیورسٹی میں اُردو کلاس کو نذر کرنے لایا تھا۔ یونیورسٹی میں تو ہم لوگ گئے تھے مگر اُردو کلاس کے انچارج ایک بھارتی صاحب تھے جن کا سلوک ہمارے وفد کے ساتھ کچھ اچھا نہیں تھا۔ سو میں نے مصلحتاً کتاب انہیں پیش نہ کی اور وہ اب کام آ گئی۔ جب الوداعی دعوت میں یونین نے ہر رکن کو تحائف پیش کیے تو فیض صاحب نے بھی جوابی تحائف کا ''برگِ سبز'' یونین کے صدر کو پیش کیا۔ عجیب بات ہے کہ سب چینی میری کتاب پر جھپٹے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ کتاب میری ہے اور میں شاعر بھی ہوں تو سب نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا اور شکایت کرنے لگے کہ تم نے پورے ایک ماہ کے دوران ایک بار بھی یہ کیوں نہیں بتایا کہ تم شاعر بھی ہو۔ میں نے کہا کہ یہ بتانا تو ہمارے لیڈر کا فرض تھا۔ یہ سوال انہی سے جا کر پوچھیے۔

اس شہر کا نام یاد نہیں آ رہا جہاں ایک سمندر نما جھیل دیکھ کر ہم دم بخود رہ گئے۔ ہمیں دخانی کشتی میں بٹھا کر جھیل کی سیر کرائی گئی جس کے وسط میں ایک جزیرہ سا تھا اور اس جزیرے پر ایک ریستوران تھا۔ یہاں ہمارا قافلہ رکا تو بیشتر لوگ بیئر کی بوتلوں پر جھپٹے۔ میں نے اورنج جوس اور شاید ایک دو حضرات نے

بھی صرف اورنج جوس پر اکتفا کی۔ میرے ہاتھ میں جُوس کا گلاس تھا اور میں جزیرے پر درختوں کی وہ قطار دیکھ رہا تھا جن کی دھاگے کی سی باریک اور جھیل کے پانی پر جھکی شاخیں ہوا کے ذرا سے جھونکے سے دور دور تک لہرا جاتی تھیں۔ یکایک فیض صاحب نے قہقہوں کے ساتھ اپنا بیئر کا گلاس میری اورنج جوس کے گلاس میں انڈیل دیا۔ میں نے اپنا یہ آلودہ جوس جھیل کے پانی میں گرا دیا تو فیض صاحب نے سخت شکایت کی کہ میں نے ایک نعمت کی ہتک کی ہے اور وہ آئندہ کبھی مجھے شراب پینے پر مجبور نہیں کریں گے۔ اور واقعی وہ اپنے اس عزم پر قائم رہے بلکہ بعض محفلوں میں، جہاں شراب اندھا دھند پی جا رہی تھی، فیض صاحب نے ان نشے میں دھت لوگوں کی دستبرد سے مجھے بچائے رکھا، جو نشے کے عالم میں بضد تھے کہ اگر یہ شاعر پیتا نہیں ہے تو آج اسے زبردستی پلا کر چھوڑیں گے۔

دیوارِ چین کی سیر کرنے کے بعد جب ہم لوگ دیوار ہی کے قریب ایک ریستوران میں چائے پی رہے تھے تو ہمارے میزبانوں نے اصرار کیا کہ ہم انہیں پاکستانی قومی ترانہ سنائیں۔ ضمناً مجھے یاد آیا کہ میں ڈسٹرکٹ جیل کیمبل پور میں نظربند تھا جب سپرنٹنڈنٹ نے مجھے بتایا کہ حکومت کی طرف سے میرے نام چھاگلہ صاحب کے اس آرکسٹرا کا ریکارڈ آیا ہے جس کے مطابق قومی ترانہ لکھا جائے گا۔ ایک بے گناہ محبوس شاعر سے قومی ترانہ لکھنے کی فرمائش پر میں حیران رہ گیا تھا۔ میں نے صرف یہ دھمکی دینے پر اکتفا کی کہ میں یہاں جیل میں ایسا ترانہ لکھوں گا کہ حکومت یاد کرے گی اور بس!

بہرحال حفیظ صاحب کا لکھا ہوا ترانہ ہمارا قومی ترانہ قرار پایا تھا مگر یہ نیا نیا واقعہ تھا اس لیے یہ ترانہ ہم میں سے کسی کو یاد نہیں تھا۔ چینی دوستوں کی فرمائش پر ہم لوگ بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے جب مولانا اختر علی

خان نے گومگو کی یہ کیفیت اپنی حاضر دماغی سے ختم کر دی۔ انہوں نے ہم سب کو کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اس کے بعد وہ ہاتھ باندھ کر اپنے ابا جی مرحوم (مولانا ظفر علی خان) کی یہ مشہور نعت گانے لگے اور ہم سب ان کے ساتھ گانے میں شامل ہو گئے۔

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

چینی دوست ادب سے اٹنشن کھڑے رہے اور جب ہم نے "کچھ فرق نہیں اس چاروں میں" تک پہنچ کر "ترانہ" ختم کیا تو انہوں نے ہمیں اپنا قومی ترانہ سنا اور ہم نے بھی مؤدب کھڑے ہو کر یہ ترانہ سنا۔ بعد میں ہم سب واپس ہوٹل میں آئے تو ایک جگہ جمع ہوئے اور فیض صاحب نے ہم سب کی طرف سے مولانا اختر علی خان کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی حاضر دماغی نے ہمیں شرمندہ ہونے سے بچا لیا تھا۔

سنکیانگ کی طرف جاتے ہوئے ہمارا طیارہ طوفان میں گھر گیا اور ایک مقام "حامی" کی ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ نہایت تیز ہوا جب ایئرپورٹ کی تنصیبات میں سے گزرتی تھی تو باقاعدہ انسانی چیخوں کی سی خوفناک آوازیں آتی تھیں' یہ عجیب تجربہ تھا!

رات ہم نے حامی میں گزاری۔ دوسرے روز حامی کے کمیون (چوپال) پر گئے تو وہاں ہمارا تعارف فتح خان اور نور خان اور لعل بیگ کے سے ناموں والے چینی ترکستانیوں سے ہوا۔ فضا صاف ہونے پر ہم اُرمچی پہنچے۔ سب سے پہلے ہمیں لڑکیوں کے ایک ڈانسنگ سکول کی سیر کرائی گئی اور ایک دراز قد نوجوان ترکستانی لڑکی نے' جو بچیوں کو رقص کی تربیت دیتی تھی' ہمارے وفد کو اپنے رقص سے محظوظ کیا۔ یہ لڑکی ایک دائرے میں یوں رقص کر رہی تھی جیسے یہاں سے وہاں تیرتی ہوئی جا رہی ہے۔ صورت کی بھی پیاری تھی۔ ہم لوگ اس تواضع سے

متاثر ہوئے مگر فیض صاحب تو اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ ان کا رنگ سرخ ہوگیا۔
وہاں سے ہمیں ایک اور مقام کی سیر کو جانا تھا مگر فیض صاحب نے ہمارے ہمراہ جانے سے انکار کر دیا۔ وہ آج کی حسین وجمیل تواضع سے اس حد تک متاثر تھے کہ تنہائی میں شعر کہنا چاہتے تھے۔ سنکیانگ پر ان کی نظم شاید اسی تاثر کا اظہار ہے

ساقیا! رقص کوئی، رقصِ صبا کی صورت
مطربا! کوئی غزل رنگِ حنا کی صورت

ہمیں اُرمچی کے شمال مغرب میں پھیلی ہوئی وسیع چراگاہیں دکھائی گئیں جہاں چرواہے گھوڑوں پر سوار سینکڑوں بھیڑوں کے گلوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ ہماری مدارات کے سلسلے میں وہاں ایک خوبصورت خیمہ نصب تھا۔ اندر غالیچوں اور گاؤ تکیوں کی فرشی نشستیں تھیں۔ دو نوجوان ترکستانی لڑکیاں ہماری دعوت کا سامان سامنے رکھے ہماری منتظر تھیں۔ وہاں کا رواج ہے کہ اپنے معزز مہمانوں کی دعوت کے موقعے پر قبیلے کی دو کنواری لڑکیاں مہمانوں کو کھانا نکال کر دیتی ہیں۔ ہمیں بھی ان لڑکیوں نے کھانا دیا، ساتھ ہی دودھ کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں بھی تھیں۔ معلوم ہوا کہ ان پیالیوں میں گھوڑی کا دودھ ہے جو صرف معزز مہمانوں کی نذر کیا جاتا ہے۔ کسی نے بھی گھوڑی کا دودھ پینے کا حوصلہ نہ کیا۔ میں فیض صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا کہ اگر یہ دودھ کسی نے بھی نہ پیا تو میزبان برا مان جائیں گے۔ فیض صاحب بولے ''تو پھر آپ ہی ہمت کیجئے۔ شراب نہیں پیتے تو دودھ ہی پی لیجئے۔'' میں نے وہ دودھ پی لیا اور پھر اتنے شدید فلو میں مبتلا ہوگیا اور مجھے اتنا تیز بخار ہوگیا کہ واپس پیکنگ پہنچنے پر دو تین روز تک ڈاکٹر مسلسل میرے علاج میں مصروف رہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میرے گھوڑی کا دودھ پینے کی خبر کراچی کے روزنامہ ''ڈان'' میں چھپ گئی اور

اس کے بعد ''فتوے'' جاری ہوتے رہے کہ گھوڑی کا دودھ حلال ہے یا حرام ہے۔

فیض صاحب میری مزاج پرسی کو آئے تو بولے ''گھوڑی کا دودھ حرام ہی ہوگا مگر ہمیں یہ تشفی ہے کہ کوئی حرام چیز تو آپ کے معدے میں اتری!''

لاہور واپس آ کر ہم اپنے اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ لائل پور کاٹن ملز کے مشاعرے میں شرکت کے لیے ہندوستان سے اسرار الحق مجاز کے علاوہ حضرت فراق گورکھپوری بھی تشریف لائے تھے۔ مجاز صاحب دفتر ''امروز'' میں مجھ سے ملنے آئے تو یہ نہایت دلچسپ واقعہ ہے جس کی تفصیل آئندہ کسی موقعے پر بیان کروں گا۔ البتہ فراق صاحب کی تشریف آوری ہمارے لیے ایک دلآویز واقعہ تھی۔

میں ''امروز'' کے دفتر میں بیٹھا تھا جب فراق صاحب تشریف لے آئے۔ شیروانی پہن رکھی تھی جس کے سب بٹن کھلے تھے۔ ہاتھ میں چھڑی تھی۔ میں برسوں سے ان کا عقیدت مند تھا۔ میرے ہاں ان کی آمد میرے لیے سرمایۂ افتخار تھی۔ میں نے عرض کیا کہ کیا آپ چائے پسند فرمائیے گا کیونکہ اخباروں کے دفتروں میں واحد مدارات چائے ہی سے ہوتی ہے۔ فراق صاحب بولے ''وہ تو ہم ضرور پئیں گے مگر پہلے فیض کو بلاؤ۔ اس سے بالمشافہ دو دو باتیں ہو جائیں۔''

دراصل ان دنوں کسی مسئلے پر فراق صاحب اور علی سردار جعفری صاحب کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا تھا اور دونوں اخباروں اور رسالوں میں ایک دوسرے سے اختلاف کا اظہار کر رہے تھے۔ فیض صاحب نے ایک بیان میں جعفری صاحب کا ساتھ دیا تھا اور فراق صاحب اسی سلسلے میں فیض صاحب سے ''دو دو باتیں'' کرنا چاہتے تھے۔

میں نے فیض صاحب کو فون پر اطلاع دی کہ فراق صاحب میرے ہاں

تشریف فرما ہیں اور آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ فیض صاحب فوراً پہنچے۔ فراق صاحب سے معانقہ کیا۔ تب فراق صاحب نے کہا ''ہاں تو فیض! تحریری اختلاف سے خواہ مخواہ گرد اڑتی ہے۔ بالمشافہ گفتگو ہو جائے تو اس سے بدرجہا بہتر ہے۔ سو بتاؤ کہ علی سردار جعفری کے نظریاتی بچپنے کا تمہارے پاس کیا جواز ہے؟'' فیض صاحب نے ہاتھ جوڑ دیے اور بولے ''میں آپ کے ساتھ اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا فراق صاحب! میں معذرت چاہتا ہوں۔''

فراق صاحب نے کہا ''مگر اخباروں میں تو تم نے دبنگ بیان دے دیا تھا میرے نقطۂ نظر کے خلاف۔''

فیض صاحب بولے ''میں معذرت خواہ ہوں فراق صاحب! بس کوتاہی ہوگئی۔ جانے دیجئے۔''

اب فراق صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے ''ہاں بھئی ندیم! اب منگاؤ چائے۔ فیض نے تو ہتھیار ڈال دیے ہیں۔''

جب فراق تشریف لے گئے تو میں نے فیض صاحب سے عرض کیا ''ایک دم اتنی معذرت کی کیا ضرورت تھی فیض صاحب تھوڑا سا تبادلۂ خیالات ہو جاتا تو کیا بُرا تھا۔''

فیض صاحب بولے ''آپ نہیں جانتے ندیم صاحب! یہ شخص بلا ہے بلا۔ اس نے اُردو، انگریزی، فارسی اور ہندی ادب کو گھوٹ کے پی رکھا ہے۔ شکست ہماری ہی ہوتی اس لیے ہم نے معذرت ہی میں عافیت سمجھی!''

لاہور میں پاکستان آرٹس کونسل اسلام آباد کے زیرانتظام ایک تقریب منعقد ہوئی۔ مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا مگر میں مصروفیت کی وجہ سے شامل نہ ہو سکا۔ ایک شام کو ابن انشاء صاحب میرے پاس آئے اور بولے ''آج ابھی ابھی ایک اجلاس کے بعد فیض صاحب نے متعدد اہلِ قلم کو ایک کمرے میں جمع کر کے

پاکستان کو ایفرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کا رکن بنانے کی تجویز پیش کی ہے۔
میں نے عرض کیا کہ پاکستان تو ایفرو ایشیائی کانفرنس کا رکن ہے اور ندیم صاحب
اس کے چیئرمین ہیں۔ اس کی ایک باقاعدہ ورکنگ کمیٹی ہے جس کے رکن پورے
پاکستان سے نامزد کئے گئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کانفرنس کا مرکز کولمبو
ہے اور چین اس کا نگران ہے۔ آپ کی کانفرنس کا نگران روس ہے اور اس کا مرکز
قاہرہ ہے چنانچہ کسی تصادم سے بچنے کے لیے آپ اس کانفرنس کی رکنیت اختیار
کرنے سے پہلے ندیم صاحب سے بات کر لیجئے جو لاہور ہی میں موجود ہیں۔
یوں یہ اجتماع ختم ہوگیا۔ فیض صاحب نے آپ سے بات کرنے کا وعدہ کیا ہے۔
امید ہے کل وہ آپ کے پاس آئیں گے۔"

اور فیض صاحب آئے۔ قاہرہ کے مرکز والی کانفرنس کی رکنیت کا ذکر
چھیڑا تو میں نے عرض کیا کہ میں پہلے اپنی مجلس عاملہ کے ارکان سے پوچھ لوں
کہ کولمبو کے مرکز والی کانفرنس پہلے سے موجود ہے۔ اگر وہ آپ کی تجویز مان گئے
تو تب آپ قاہرہ مرکز کی رکنیت کی بات کیجئے گا۔ ذرا سا توقف فرما لیجئے۔"

فیض صاحب میری بات سنتے رہے۔ پھر تشریف لے گئے اور اسی شام
کو انہوں نے مجھے اطلاع دیے بغیر اہل قلم کو جمع کر کے صفدر میر کو افریشیائی
ادیبوں کی کانفرنس کے روسی دھڑے کا کنوینر نامزد کیا اور پاکستانی ادیبوں کی
طرف سے اس کانفرنس کی رکنیت کی درخواست تیار کر لی۔ مجھے فیض صاحب کے
اس خود سرانہ رویے کا نہایت افسوس ہوا۔ دراصل وہ قاہرہ مرکز کی کانفرنس کی
پاکستانی رکنیت کے لیے اس لیے بے چین تھے کہ وہ قاہرہ کانفرنس کے اجلاسوں
میں بحیثیت مبصر شریک ہوتے رہتے تھے اور وہاں پاکستان کی نمائندگی بھارت
کے علی سردار جعفری صاحب کرتے تھے۔ فیض صاحب چاہتے تھے کہ انہیں ان
اجلاسوں میں پاکستان کے آفیشل رکن کی حیثیت سے شرکت کا حق ملے۔ سو

انہوں نے جلد بازی سے کام لیا اور یہ نہ سوچا کہ اسی نام کی کولمبو مرکز والی کانفرنس سے اختلاف کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ مگر میں نے ایسا نہیں ہونے دیا اور اپنی مجلسِ عاملہ کے جن ارکان نے فیض صاحب کے رویے پر اعتراض کیا' انہیں سمجھا بجھا کر خاموش کر دیا۔ دراصل قاہرہ مرکز زیادہ سرگرم تھا۔ اس کا ایک خوبصورت رسالہ ''لوٹس'' بھی تھا۔ اس کے ایڈیٹر یوسف السباعی کے قتل کے بعد فیض صاحب اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہ رسالہ نہایت اہتمام سے چھپتا تھا۔ پورے افریقہ اور ایشیا بشمول پاکستان کے ادیبوں شاعروں کے انگریزی تراجم اس میں شائع ہوتے تھے۔ فیض صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والے ''لوٹس'' کو میری شاعری یا افسانہ نگاری کا نوٹس لینے کی کبھی توفیق نہ ہوئی اور دیگر اہلِ قلم کے تراجم باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے۔ میں سمجھ گیا کہ فیض صاحب میرے حوالے سے کسی نہ کسی ڈھکے چھپے تعصب میں ضرور مبتلا ہیں ورنہ میں ایسا گم نام تو نہیں تھا کہ ان کے ''الٹرا ماڈرن لوٹس'' کے صفحات میں بار نہ پا سکتا!

جنرل ایوب کے دور آمریت میں سرکاری سطح پر پاکستانی کلچر کے تعین کے سلسلے میں فیض صاحب کی رہنمائی میں ملک کے اہلِ فن اور اہلِ دانش سے مکالمے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پشاور سے ڈھاکہ تک فیض صاحب اپنے بعض ساتھیوں کے ہمراہ اسی سلسلے میں دورے کرتے رہے۔ لاہور میں ان کا قیام سب سے زیادہ طویل تھا مگر وہ میرے پاس تشریف نہ لا سکے اور نہ مجھے اپنے ہاں بلا بھیجا۔ شاید انہوں نے مجھے کلچر کے موضوع پر گفتگو کے قابل ہی نہ سمجھا جبکہ پاکستانی کلچر سے متعلق میرے متعدد مضامین ''امروز'' میں شائع ہوتے رہے تھے اور فیض صاحب ان سے بے خبر نہیں تھے۔ بہرحال وہ شعر و فن سے متعلق اپنے پسندیدہ لوگوں کے انٹرویو ریکارڈ کرتے رہے۔ ان کی اس نوع کی بے اعتنائیوں کے سلسلے میں اب میری حیرت ختم ہو چکی تھی۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ شعوری

طور پر مجھے پس منظر میں رکھنا چاہتے ہیں۔ کیوں؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا جبکہ میں تو ان کا غیر مشروط نیازمند تھا۔

ایوب خان ہی کے دور میں الطاف گوہر صاحب (سیکرٹری اطلاعات حکومتِ پاکستان) نے پاکستان کا ''ھُو اِز ھُو'' مرتب کرنے کا ایک منصوبہ فیض صاحب کے سپرد کیا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ مشہور صحافی ظہیر صدیقی اس منصوبے میں ان کے دستِ راست تھے۔ اس ''ھُو اِز ھُو'' کی ایک جلد میں نے روزنامہ ''ڈان'' کراچی کے دفتر میں دیکھی تھی۔ اس میں میرا بھی ذکر تھا مگر مجھے انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری کی بجائے محض ایک ''لبرل رائٹر'' بتایا گیا تھا۔

پھر فیض صاحب کراچی میں عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل اور یتیم خانہ وغیرہ کے مہتمم مقرر ہوئے اور ان سے ملاقاتوں میں کمی آ گئی۔ رحیم یار خان کے ایک مشاعرے میں تشریف لائے تو مجھ سے لاہور کا حال پوچھا۔ میں نے عرض کیا ''ویسے تو لاہور میں درجہ بدرجہ خیریت ہی ہے مگر شہر میں افواہ گرم ہے کہ شاہی مسجد کے پڑوس میں جو محلّہ ہے اس کے ایک گھر میں گلشن نام کی ایک رقاصہ رہتی ہے اور اس نے گھر کے دروازے پر آپ کے مصرعے کا بورڈ لگا رکھا ہے۔

چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

فیض صاحب کچھ جھینپے ضرور مگر پھر بے اختیار ہنس دیے۔ میں مشاعرے میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ میری باری آئی تو میں نے اُس دور کی ایک بالکل تازہ غزل پیش کی جس کا مطلع تھا:

عمر بھر اس نے اسی طرح لبھایا ہے مجھے
وہ جو اِس دشت کے اُس پار سے لایا ہے مجھے

آخری شعر تھا:

اے خدا! اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے
تو نے اِس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

میں غزل پڑھ کر واپس فیض صاحب کے پاس آ کر بیٹھا تو فیض صاحب بولے ''آپ تو زبان کے سلسلے میں خاصے محتاط ہیں مگر آخر کیا بات ہے کہ آپ تذکیر و تانیث کی غلطیاں کرنے لگے ہیں۔'' میں نے پوچھا ''مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے فیض صاحب؟'' بولے ''آپ نے غزل کے آخری شعر میں کہا ہے---- ''اے خدا اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے!'' آپ نے فردوس کو مذکر قرار دیا ہے جبکہ آپ پاکستانی فلموں کی جس مشہور ہیروئن فردوس پر اپنا حق جتا رہے ہیں وہ خاتون ہے' سو مونث ہے!''

ہم اس بات پر دیر تک ہنستے رہے۔ تب میں ہنستے ہوئے صرف اتنا کہہ سکا ''فیض صاحب! آپ نے تو گلشن والے لطیفے کا فوراً ہی انتقام لے ڈالا ہے۔''

فیض صاحب ایک دو دن کے لیے لاہور آئے تو عزیزی ظہیر بابر اور بہن خدیجہ مستور نے انہیں اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ دوسرا مہمان صرف میں تھا۔ ہم چاروں نے مزے لے لے کر اور شگفتہ باتیں کر کے خوب لطف اٹھایا۔ خدیجہ بلا کی فقرے باز تھیں۔ وہ فقرے پر فقرہ مار رہی تھیں اور ہم ہنس رہے تھے۔ کھانے کے بعد پھل لائے گئے۔ نہایت خوبصورت انگوروں کے طشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے فیض صاحب سے کہا ''فیض صاحب! یہ انگور بہت عمدہ ہیں۔ ضرور چکھیے۔'' وہ بولے ''ہمیں انگور اس کچی صورت میں پسند نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''معاف کیجئے' مجھے معلوم تھا کہ آپ کو تو انگوروں کی صرف متعفن صورت پسند ہے۔'' اس پر سب کھل کے ہنسے۔

فیض صاحب نے قیامِ کراچی کے دوران ایک ادبی انجمن بھی قائم کی

جس کا نام بھول رہا ہوں۔ اس نام میں ''عوامی'' کا لفظ بھی شاید شامل تھا۔ بہرحال جب اس کا منشور شائع ہوا تو میں یہ پڑھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں پاکستان سے متعلق قریب قریب وہی نقطۂ نظر پیش کیا گیا تھا جو اُس دور کے روسی دانش ور تواتر سے پیش کر رہے تھے۔ وہ نقطہ ٔنظر یہ تھا کہ بھارت صرف ایک قوم کا ملک ہے مگر پاکستان میں پانچ قومیں بستی ہیں۔ ظاہر ہے اس نقطۂ نظر میں دانش کا کوئی دخل نہ تھا بلکہ یہ سراسر سیاسی نظریہ تھا اور روس اور بھارت کے سیاسی اور دفاعی معاہدوں کا آئینہ دار تھا۔ فیض صاحب کی اس انجمن کے منشور میں بھی پاکستان کو پانچ قوموں پر مشتمل ملک قرار دیا گیا تھا۔ میں نے ''امروز'' ہی میں ایک مضمون کے ذریعے وضاحت کی کہ پاکستان میں صرف ایک قوم آباد ہے جسے پاکستانی قوم کہتے ہیں۔ آپ نے جن ''قوموں'' کا ذکر فرمایا ہے وہ دراصل ''قومیتیں'' ہیں۔ قوم اور قومیت میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے اسے فیض صاحب سے بہتر کون جانتا ہوگا' مگر اس منشور میں یہ کیسی بات کہی گئی ہے جو پاکستان کے انتشار کی نشان دہی کر رہی ہے۔ متعدد دیگر اصحاب نے بھی میرا ساتھ دیا اور یہ انجمن ابتدائی سرگرمی کے بعد ختم ہوگئی۔

حیدرآباد میں ایک سیمینار تھا۔ مجھے لاہور سے بلایا گیا اور فیض صاحب کراچی سے تشریف لائے۔ مجھے سیمینار کے منتظمین نے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا تھا۔ فیض صاحب تالپوری حضرات کے مہمان تھے۔ سیمینار ختم ہوا تو رسول بخش تالپور صاحب میرے پاس آئے اور فرمایا۔ ''آپ حیدرآباد آئے اور کہیں اور ٹھہر گئے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اگر ہمارے عزیز مہمان کہیں اور ٹھہر جائیں تو ہم انہیں اٹھوا لیتے ہیں۔ کیا ارادے ہیں آپ کے؟'' میں نے عرض کیا کہ افراد کو اٹھوا لینے میں تو یقیناً آپ کو یدِطولیٰ حاصل ہے مگر میں تو سیمینار کے منتظمین کے بس میں تھا۔ کیا کرتا۔ فیض صاحب بھی تالپور صاحب کی طرح اصرار کرنے لگے

کہ ہمارے ساتھ چلو۔ میں نے عرض کیا کہ کل مجھے ایک ادبی محفل کی صدارت کرنی ہے جس میں حیدرآباد کے تین چار نوجوان افسانہ نگار اپنے افسانے پڑھیں گے اور محترم ڈاکٹر احسن فاروقی بضد ہیں کہ میں اس میں ضرور شرکت کروں۔ میرے پاس ایک یہی سوٹ ہے جو میں نے پہن رکھا ہے۔ آپ کے ساتھ جاؤں تو سونے کے کپڑے کہاں سے لوں گا اور اس سوٹ کو کل کے لیے کیسے بچاؤں گا۔ رسول بخش صاحب بولے ''معلوم ہوتا ہے آپ اپنے اٹھوائے جانے پر بضد ہیں۔'' عرض کیا ''ویسے تو اس سلسلے میں آپ کی بڑی شہرت ہے مگر---'' مگر فیض صاحب نے مجھے ہاتھ سے کھینچ کر کہا ''نہیں آپ چلیں گے ہمارے ساتھ۔''

قہرِ درویش برجانِ درویش میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں رسول بخش صاحب کی پجیرو ایک بہت بلند دروازے کے سامنے رکی۔ ہم تینوں ایک ہال میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی دو درجن وڈیرے حضرات وہسکی پی رہے تھے اور ہال میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ فیض صاحب کو سب پہچانتے تھے۔ ''فیض آ گئے۔ فیض آ گئے۔'' کا شور اٹھا اور وہسکی کی ایک بوتل کے ہمراہ تین گلاس فوراً ہمارے سامنے سج گئے۔ پلانے والے صاحب سے فیض صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ نہیں پیتے۔'' وہ صاحب بولے۔ ''نہیں پیتے تو آج پئیں گے۔ کیسے نہیں پئیں گے۔ ہم انہیں گرا کر پوری بوتل ان کے منہ میں خالی کر دیں گے!'' ---نوجوان کے تیور دیکھ کر فیض صاحب اور رسول بخش صاحب دونوں نے وہاں سے کسی بہانے اٹھ جانے کا فیصلہ کیا اور وہ وہاں سے نکل بھی آئے اور مجھے اس سلوک سے بچا لیا جو شاید میرے ساتھ واقعی ہونے والا تھا۔

ہم تالپوریوں کے بنگلے پر پہنچے۔ سمندر کی طرف سے ٹھنڈی لطیف ہوا آ

رہی تھی۔ تالپوری بنگلے کے باہر لان پر صوفے سجے ہوئے تھے۔ وسط میں دو چار میزیں سلیقے سے رکھی تھیں۔ وسطی بڑی میز پر شراب کی سرخ، زرد اور سبز رنگ کی عمر خیامی بوتلیں قطار میں کھڑی تھیں۔ رسول بخش تالپور صاحب کے بڑے بھائی میر علی احمد تالپور صاحب ہمارے انتظار میں تھے۔ فیض صاحب کے علاوہ وہ مجھ سے بھی بڑے تپاک سے ملے اور وہسکی پیتے ہوئے میرے اشعار سنانے لگے۔ میں حیرت زدہ رہ گیا کہ تالپور صاحب نے میرے جتنے شعر سنائے ان میں سے آدھے خود مجھے بھی یاد نہیں تھے۔ پھر انہوں نے فیض کے، فراق کے، غالب کے اور میر کے، حافظ اور سعدی کے، نظیری اور بیدل کے اتنے بہت سے شعر اتنے عمدہ لہجے میں سنائے کہ لطف آ گیا۔ ساتھ ساتھ علی احمد صاحب اور فیض صاحب وہسکی پیتے رہے۔ میں نے رسول بخش صاحب سے سرگوشی میں کہا۔ ''میں تو محروم ہوں مگر کیا آپ یہ شوق نہیں کرتے؟'' بولے ''بڑے بھائی کے سامنے میں وہسکی پینے کی بے ادبی نہیں کر سکتا۔ ویسے پیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ کم سے کم آج تو اس معاملے میں آپ میرے ساتھی نکلے۔''

کافی دیر کے بعد علی احمد صاحب اٹھے اور بولے۔ ''معذرت! میں ابھی کچھ دیر میں حاضر ہوتا ہوں۔'' اور وہ تشریف لے گئے۔

رسول بخش صاحب نے بتایا کہ جب بھائی جان پر سرور کا عالم طاری ہونے لگتا ہے تو وہ محفل سے اٹھ جاتے ہیں اور جا کر سو رہتے ہیں۔ وہ اب یہاں واپس نہیں آئیں گے۔''

میں نے عرض کیا، ''رسول بخش صاحب! آپ مجھے وہاں سے اٹھوا تو لائے مگر اب تک نہ آپ نے خود کچھ کھایا ہے نہ میرے کھانے کا کچھ بندوبست کیا ہے اور اب تو شاید فیض صاحب کو بھی کھانے کی ضرورت ہوگی۔''

تالپور صاحب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''یہ خیال تک نہ آیا کہ کھانا

بھی تو کھانا ہے۔''

فیض صاحب بولے۔ ''ہم نہیں کھائیں گے۔''

رسول بخش صاحب نے کہا ''مگر ندیم صاحب کا کیا ہوگا۔ ندیم صاحب' آپ میرے ساتھ آیئے۔ کچن میں جا کر دیکھتے ہیں کچھ نہ کچھ تو رکھا ہوگا۔'

فیض صاحب مسلسل وِہسکی پینے میں مصروف تھے۔ ہم دونوں بنگلے کے اندر داخل ہوئے۔ ایک طرف سے ڈھولک اور نسوانی آوازوں میں سندھی گانے سنائی دیے۔ پردے کے پیچھے سے رسول بخش صاحب نے مجھے یہ منظر دکھایا جس میں بہت سی عورتیں سندھ کا بوقلموں لباس پہنے دائرے میں ناچ رہی تھیں۔ کوئی تقریب ہوگی۔ میں نے تفصیل نہ پوچھی کیونکہ میں تو بھوک سے بے حال ہو رہا تھا۔ وسیع و عریض کچن میں رسول بخش صاحب یہاں سے وہاں تک دیگچوں اور دوسرے برتنوں میں جھانکتے رہے آخر انہیں پکوڑوں کی شکل کی کوئی چیز ملی۔ وہ اٹھا لائے مگر وہ چیزیں ٹھنڈی ہو چکی تھیں اور کھانے کے لائق نہیں تھیں۔ میں نے کہا ''رسول بخش صاحب چلیے' کھانے پر مٹی ڈالیے۔ اب باہر چلیں اور ذرا سا سو لیں' کیونکہ رات کے دو بج رہے ہیں۔ آپ یوں کریں کہ میرا یہ سوٹ بچانے کے لیے کوئی شلوار وغیرہ لا دیں۔''

میں باہر فیض صاحب کے پاس آ گیا۔ کچھ دیر کے بعد رسول بخش صاحب ایک بڑی سی سندھی شلوار لے آئے اور میرے حوالے کر دی۔ میں نے یونہی تجربتاً اسے کھولا تو وہ کھلتی چلی گئی۔ ایک پائنچے میں ٹانگ ڈالی تو وہاں آٹھ دس ٹانگوں کی گنجائش تھی۔ میں نے کہا ''فیض صاحب آپ اور میں اس شلوار کے ایک ہی پائنچے میں سما جائیں گے۔ تشریف لایئے کہ شلوار کا یہ ایک پائنچہ اوڑھ کر تھوڑا سا سو لیں۔''

فیض صاحب ہنستے رہے اور رسول بخش صاحب کہتے رہے ''کیا کیا

جائے۔ ہم سندھیوں کی شلوار تو ایسی ہی مردانہ ہوتی ہے۔''

میں نے سوٹ کے ساتھ ہی سو جانے کا فیصلہ کیا اور رسول بخش صاحب نے سونے کے لیے جانے کی اجازت مانگی۔ البتہ ہمیں خبردار کیا کہ کتے کھول دیے گئے ہیں۔ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت پڑے تو پلنگ پر سے ہی طلب کر لیجئے گا۔ خدمتگار آپ کے آس پاس موجود ہوں گے۔ اور فیض صاحب صبح ٹھیک پانچ بجے کار تیار ہوگی۔ آپ کو واپس کراچی جانا ہے اور ندیم صاحب آپ کو اپنا سامان سمیٹنے اپنے ہوٹل جانا ہے۔ سو شب بخیر۔''

وہ تو چلے گئے مگر فیض صاحب نے وہسکی پینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر میں نے عرض کیا ''فیض صاحب! اب بس بھی کیجئے۔ آخر پینے کی کوئی تو حد بھی ہوتی ہوگی۔''

ایک مزید پیگ پینے کے بعد فیض صاحب پلنگ پر آگئے اور بولے ''چلیے' آپ کہتے ہیں تو ہم ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔''

پھر وہ سرور کے عالم میں شعر و شاعری اور مصوری و موسیقی کے بارے میں خوبصورت باتیں کرتے رہے۔ ایک بار رک کر مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں سوتا بن گیا کہ شاید وہ بھی مجھے خاموش پا کر ذرا سا سو لیں۔ میں نہیں بولا تو وہ چپکے سے اٹھے اور میز پر سے ایک بوتل اٹھا کر ایک پیگ تیار کیا اور پینے لگے۔

میں نے کہا ''فیض صاحب!''

چونک کر بولے ''ارے---- تو آپ جاگ رہے ہیں!''

میں نے عرض کیا:

چلا نہ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر
ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

فرمایا ''اچھا آپ کہتے ہیں تو ختم۔'' آخری پیگ پیا اور آ کر پلنگ پر

لیٹ گئے مگر چار بج چکے تھے۔ نیند کیسے آتی۔ ساڑھے چار بجے ڈرائیور نے چلنے کو کہا۔ ہم دونوں کار میں جا بیٹھے اور میں حیران ہوتا رہا کہ فیض صاحب کا ہاضمہ کس بلا کا ہے کہ رات گیارہ بجے سے صبح چار بجے تک مسلسل پیتے رہے ہیں مگر نہ زبان لڑکھڑائی نہ چلنے میں توازن بگڑا۔ میں نے کار میں اس بات پر انہیں داد بھی دی تو وہ بولے "شکریہ۔ مگر ہم نے زیادہ تو نہیں پی!"

جو شخص مسلسل پانچ گھنٹے شراب پیتا رہا ہو' وہ اگر یہ کہے کہ میں نے زیادہ تو نہیں پی' تو وہ یقیناً نشے میں ہے۔ میں نے اس روز پہلی بار فیض صاحب کو "نشے" میں دیکھا!

فیض صاحب کو سوویٹ روس کی حکومت نے "لینن امن انعام" دیا۔ اس کے ذکر سے پہلے ایک حالیہ واقعہ یاد آ رہا ہے کہ انگریزی روزنامہ "فیشن" لاہور کی ۲۷ جولائی ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں' فیض صاحب پر پروفیسر جیلانی کامران کا ایک کالم شائع ہوا جس میں جدید عالمی حقائق پر فیض صاحب کی گہری نظر کے حوالے سے انہوں نے لکھا کہ میں نے ایک ملاقات میں یہ سوچ کر فیض صاحب سے ایک تیز دھار سوال پوچھا کہ وہ ترقی پسندانہ انداز میں گھڑا گھڑایا جواب دیں گے۔ سوال یہ تھا کہ ۱۷۸۹ء کے انقلابِ فرانس کے بعد آپ کی نظر میں جدید ترین تاریخ کا اہم واقعہ کیا ہے؟ فیض صاحب نے کچھ سوچ کر جواب دیا کہ ۱۷۸۹ء کے بعد انقلابِ ایران عظیم ترین واقعہ ہے! یہ جواب سن کر پروفیسر جیلانی کامران اس حد تک متاثر ہوئے کہ انہوں نے فیض صاحب کو اسلامی تاریخ کے عظیم دانش وروں میں شامل کر دیا اور یہ تک کہہ دیا کہ مسلم دانشور کی حیثیت سے فیض صاحب کا کوئی مثیل ہی نہیں---- اور فیض صاحب کے ہم خیالوں اور عقیدت مندوں نے سوچا کہ فیض صاحب کو انقلابِ فرانس کے بعد دو صدیوں تک یعنی آج تک کوئی دوسرا عظیم واقعہ یا عظیم انقلاب کیوں یاد نہ

آیا جبکہ انقلاب روس اور انقلابِ چین تو بیسویں صدی کے عظیم ترین انقلاب ہیں۔ کیا فیض صاحب ان انقلابات کو کسی اندرونی خوف کی وجہ سے گول کر گئے؟ آخر ان کے علاوہ مصر اور لیبیا میں بھی تو ایران کی طرح بادشاہتیں ختم کی گئیں اور ویت نام کے انقلاب نے تو امریکہ کی سی سپر طاقت کو مکمل اور ہمہ جہتی شکست کا مزہ چکھا دیا تھا۔ ایران کا انقلاب یقیناً اہم ہے مگر وہ انیسویں اور بیسویں صدی کے دوسرے انقلابات کی صف میں شامل ہے۔ فیض صاحب نے اسے نہ جانے کس سبب سے انقلاب فرانس کے بعد عظیم ترین انقلاب قرار دے ڈالا تھا۔ اس کا یقیناً کوئی باطنی سبب ہوگا۔ اور پھر یہ پروفیسر جیلانی کامران بھی اگر فیض صاحب کا یہ جواب سن کر جھوم گئے تو ہمارے جدید ادب کی اس پڑھی لکھی شخصیت کا یوں جھوم جانا بھی ایک حیرت آمیز استفہامیہ تخلیق کرتا ہے!

فیض صاحب جب ماسکو میں لینن امن پرائز لینے کے بعد لندن سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے تو انہوں نے بالکل ویسا ہی اوورکوٹ پہن رکھا تھا جیسا لاہور میں ہم چند ترقی پسند مصنفین نے لنڈے بازار سے خریدا تھا۔ ایک محفل میں جب فیض صاحب وہی کوٹ پہنے تشریف لائے تو میرے پاس آ بیٹھے۔ میں نے ان کے کوٹ کی آستین کو تھپتھپا کر پوچھا ''یہ دانہ کتنے میں آیا ہے فیض صاحب؟''

''دانہ؟'' فیض صاحب حیران رہ گئے۔

میں نے کہا ''لنڈے بازار والے سب سیکنڈ ہینڈ کپڑوں کو ''دانہ'' ہی کہتے ہیں۔''

فیض صاحب بولے ''لنڈا بازار والے کہتے ہوں گے۔ ہم نے تو یہ دانہ لندن سے خریدا ہے۔''

میں نے کہا ''کوئی پوچھے تو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ کوٹ لنڈن سے

آیا ہے جبکہ لنڈن کی بجائے لنڈے بازار سے آیا ہوتا ہے۔"

فیض صاحب "لاحول ولا" کہہ کر رہ گئے اور ہم دو تین مصنفین، جنہوں نے لنڈے کے ایسے ہی کوٹ پہن رکھے تھے، دل کھول کر ہنسے۔

کراچی سے صہبا لکھنوی نے اپنے رسالے "افکار" کا ندیم نمبر نکالا تو میرے بارے میں علم و ادب کی بڑی بڑی شخصیات کی آرا بھی شائع کیں۔ جوش ملیح آبادی صاحب کا ارشاد تھا "اس دور کے جس قدر بھی شاعر ہیں، احمد ندیم قاسمی کو ان سب سے بمراحل بہتر سمجھتا ہوں۔" حفیظ جالندھری صاحب نے کہا "مجھے تو اس حلقے میں ایک بھی ایسا نظر نہیں آیا جسے کسی جہت سے بھی احمد ندیم قاسمی کا مماثل کہہ سکوں۔" اور فیض صاحب نے صرف یہ کہنا مناسب سمجھا "ادب، صحافت، اور شاعری میں ان کا مقام مسلّم ہے۔" ---- یعنی پہلے ادب، پھر صحافت اور اس کے بعد میری بے چاری شاعری! یہیں سے مجھے شک گزرتا ہے کہ فیض صاحب نے میری شاعری کے حوالے سے اپنے اندر کوئی نامعلوم تعصب پال رکھا تھا۔

بھٹو مرحوم کے دورِ حکومت میں وہ اس حکومت کے مشیر مقرر ہوئے اور گلبرگ میں ان کا دفتر قائم ہوا۔ بہرحال دس بجے قبل دوپہر کا وقت تھا جب میں اس دفتر میں امجد اسلام امجد کو ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تب بھی وہ پی رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ "امجد بہت اچھا شاعر ہے اور اس کا مستقبل ماشاء اللہ تابناک ہے اس لیے اگر آپ اس کے مجموعۂ کلام کا مختصر سا فلیپ لکھ دیں تو میں ذاتی طور پر ممنون ہوں گا۔ مگر یہ عجیب المیہ ہے کہ بھٹو کی المناک موت پر انہوں نے ایک بھی شعر نہ لکھا جبکہ مختلف احباب پر ان کی نوحہ نما غزلیں سب کے سامنے ہیں۔

فیض صاحب وہسکی کا ایک گھونٹ لے کر مسکرائے اور بولے "ہم نے

امجد کو پڑھا ہے۔ اچھی شاعری کر رہے ہیں۔ لکھ دیں گے کچھ۔"

اُن دنوں اُنہیں جب بھی دیکھا' منیر نیازی ان کے ہمرکاب ہوتا تھا جبکہ سوائے شراب نوشی کے دونوں میں کوئی قدرِ مشترک نہیں تھی۔

بعد میں ایک دن میں نے پوچھا "آپ تو چین سموکر تھے فیض صاحب! آپ کو میں نے بہت دیر سے سگرٹ پیتے نہیں دیکھا۔"

خوش دلی سے فرمایا "ہم بیک وقت سکھ اور مسلمان ہو چکے ہیں۔ تمباکو نوشی ترک کرنا پڑی سو سکھ ہوگئے۔ شراب نوشی ترک کرنا پڑی سو مسلمان ہوگئے۔"

میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے احیا کے سلسلے میں پاکستان بھر کے سینئر ترقی پسند دوستوں کو خط لکھے اور ان کی رائے پوچھی۔ فیض صاحب سے بھی پوچھا مگر انہوں نے میرے خط کا جواب دینے کی بجائے فون پر کہا کہ ہم چند روز کے اندر آپ کے پاس آ کر بالمشافہ چند تجاویز پیش کر دیں گے۔ مگر افسوس کہ وہ تشریف نہ لائے۔

میں نے اسلام آباد میں جنرل کے۔ایم۔عارف صاحب کے شعری مجموعے کی تقریب کی صدارت کی۔ ان کے بعض اشعار عمدہ تھے اور بعض میں خامیاں تھیں۔ میں نے اپنے خطبۂ صدارت میں سرِعام کہہ دیا کہ "جنرل صاحب! اول تو آپ نے بعض شعروں میں ایسی انقلابی باتیں کہی ہیں کہ اگر میں کہتا تو آج یہاں موجود نہ ہوتا (میرا مطلب تھا کہ میں جیل میں ہوتا)۔ پھر آپ کی شاعری کے اساتذہ سید ضمیر جعفری صاحب اور جناب وقار انبالوی صاحب جو میرے سامنے اس محفل میں موجود ہیں' شاید آپ کے عہدے کے ڈر سے آپ کے بعض اشعار کی خامیوں کی نشان دہی نہ کر سکے" (محترم عارف صاحب اتنے فراخ دل نکلے کہ بعد میں مجھ سے ان غلطیوں کی تفصیل پوچھی تا کہ آئندہ ایڈیشن میں وہ ان کی تصحیح کر سکیں)۔ فیض صاحب نے میری اس محفل کی صدارت کو

سراسر غلط قرار دیا کہ آخر عارف صاحب مارشل لاء کے ایک اہم کردار تھے۔ میں خاموش رہا مگر یہ عرض کرنے کو بہت جی چاہا کہ عارف صاحب تو بہرحال شاعر ہیں مگر آپ نے کس خوشی میں اپنی تاریخ کے گھناؤنے کردار---- انگریز---- کی فوجی ملازمت غلامی ہی کے دنوں میں قبول فرمالی تھی! عجیب بات ہے کہ چند ہی روز بعد اخباروں میں خبر چھپی کہ فیض احمد فیض صاحب نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کا وقت مانگا اور وہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک جنرل صاحب سے گفتگو فرماتے رہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ گفتگو صرف موسمی حالات کے بارے میں تو نہیں ہوئی ہوگی!

پھر اسلام آباد ہی میں انہوں نے پولیس کے ایک ریٹائرڈ آئی جی کے کالموں کی کتاب کی افتتاحی تقریب کی صدارت بھی فرمائی اور میں حیران ہوتا رہا کہ کے۔ایم۔عارف صاحب کی تقریب کی صدارت کے سلسلے میں وہ مجھ پر تو معترض تھے مگر آمر مطلق جنرل ضیاء الحق سے اپنی ہی درخواست پر ان کی ملاقات اور پولیس کے ایک کچھ زیادہ ہی اعلیٰ افسر کی کتاب کی افتتاحی تقریب کی صدارت کو کس کھاتے میں ڈالا جائے! سوچا ان سے اس تضاد کا پس منظر پوچھوں گا ضرور مگر وہ اس کے فوراً بعد علیل ہوگئے اور ۲۰ نومبر کو ان کا انتقال ہوگیا---- ۲۰ نومبر جو میری تاریخِ پیدائش ہے، ان کی تاریخِ وفات قرار پائی۔ فیض کے جنازے میں شرکت اور ان کی تدفین اور ان کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد میں فورٹریس سٹیڈیم کے ایک ریسٹورینٹ میں آیا جہاں میں نے اپنی سالگرہ کے سلسلے میں چند عزیزوں اور دوستوں کو کئی دن پہلے سے بلا رکھا تھا مگر یہ حادثہ ہوگیا۔ چنانچہ میں نے انہیں ایک پیالی چائے پلانے پر اکتفا کی۔

لاہور میں فیض صاحب کے دو ریفرنس منعقد ہوئے۔ میں نے دونوں میں فیض صاحب پر تحسینی مضامین پڑھے اور پھر جب فیض صاحب کی یاد میں

اوپن ایئر تھیٹر میں ایک بڑا پاک و ہند مشاعرہ منعقد ہوا تو میری باری آنے پر مجھے ہجوم میں بیٹھے ایک گروپ نے ''ھوٹ'' کر دیا کہ میں ضیاء الحق کا ہوا خواہ تھا؟!!! یعنی اُس ضیاء الحق کا ہوا خواہ جس کے منعقدہ ریفرنڈم کو میں نے اس کے زمانۂ اقتدار میں بھی ''ھیرلڈ'' کے ایک انٹرویو میں تاریخ کا سب سے بڑا فراڈ قرار دیا تھا اور جس سے ملاقات کی میں نے کبھی کوئی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔

مجھے فیض صاحب کبھی نہیں بھولیں گے اور فیض صاحب سے بے لوث عقیدت مندی کا یہ ''انعام'' بھی مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔

فیض صاحب کی شاعری کے حوالے سے اس مرحلے پر میں مختصراً یہ عرض کروں گا کہ صابر دت نے بمبئی سے اپنے رسالے ''فن اور شخصیت'' کا فیض احمد فیض نمبر شائع کیا تو مجھے بھی پیغام بھجوانے کو کہا۔ میں نے جہاں فیض کی میٹھی رسیلی شاعری کا ذکر کیا وہاں یہ بھی لکھا کہ فیض فکر و حکمت کی گہرائیوں میں جانے سے شعوری طور پر گریز کرتے تھے' ورنہ جس طرح انہوں نے اپنی شاعری میں انقلاب کے موضوع کو مترنم بنا دیا' اسی طرح وہ فکری شاعری کو بھی فنی جمالیات کا ایک شعبہ بنا سکتے تھے۔ ان کے ہاں اگر فکری گہرائی نہیں ہے تو نقاد حضرات ہی اس کے اسباب پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ ایک نہایت پڑھے لکھے اور اُردو' پنجابی کے علاوہ انگریزی' عربی اور فارسی زبانوں پر حاوی شخصیت نے فکری شاعری کو عملاً کیوں روکے رکھا' جبکہ غالب اور پھر اقبال اور دور حاضر میں راشد کی شاعری نے فکر کو شعر میں ڈھالنے کا کام آسان بنا دیا تھا۔

***

سیّد ضمیر جعفری

ہم دونوں---- ضمیر اور میں---- اختر شیرانی کے غیر مشروط عقیدت مندوں میں شامل تھے۔ اختر عموماً عالمِ سرخوشی میں رہتے تھے مگر انہیں ہم دونوں کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ تھا۔ چنانچہ وہ ہمارے ساتھ بے پناہ شفقت اور اپنائیت سے پیش آتے تھے۔ ضمیر اُن دنوں اسلامیہ کالج کے طالب علم تھے۔ وہ میری طرح اختر کے یہاں باقاعدگی سے حاضری دیتے تھے۔

مجھے اس زمانے کی ایک رات یاد ہے جب اختر شیرانی نے بے پناہ پی رکھی تھی۔ گیارہ بجے رات کا عمل ہوگا جب ہم دونوں اختر کو تھامے فلیمنگ روڈ پر ان کے گھر لائے۔ اپنے کمرے میں، جو رسالہ ''رومان'' کا دفتر بھی تھا، اختر نے مجھ سے فرمائش کی کہ ان کی کوئی نظم ترنم سے سناؤں---- ''ترنم سے؟''---- میں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو روکا اور عرض کیا کہ میں تو ترنم کی ابجد سے بھی ناواقف ہوں۔ میرا گلا تو اتنا خراب ہے کہ تنہائی میں بھی گنگناؤں تو اپنے آپ سے شرما جاتا ہوں۔ تب اختر شیرانی ضمیر کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے ''ندیم کو معاف کیا مگر ضمیر کا کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ گاؤ ضمیر ہماری نظم گاؤ۔ اے عشق کہیں لے چل---- کس حال میں ہیں یارانِ وطن---- جہاں ریحانہ

رہتی تھی---- دیارِ حضرت سلمیٰ کی سمت جاتا ہوں---- چلو، سناؤ !!'' اور ضمیر گانے لگے۔

یہ ترنم اس ترنم سے بہت مختلف تھا جس میں وہ بعد میں اپنا مزاحیہ کلام سناتے رہے اور میں سوچتا رہتا تھا کہ ان کے کلام کے مزاح پر ان کے ترنم کا مزاح سونے پر سہاگے کا کام کر رہا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ضمیر اُن دنوں نوجوان تھے۔ گلے میں توانائی اور صفائی تھی اور وہ اختر شیرانی کی نظموں کی فضا سے بھی مسحور تھے، چنانچہ انہوں نے جب اختر شیرانی کی ایک نظم ایسے دلآویز ترنم میں پڑھی تو اختر شیرانی متاثر ہو کر رونے لگے اور میں طلسم زدہ ہو کر رہ گیا۔

اُن دنوں ضمیر کے سر پر طرّے دار پگڑی ہوتی تھی۔ میں بھی طرے دار پگڑی باندھتا تھا۔ ہم اپنے ضلعوں کے لحاظ سے پڑوسی بھی تھے۔ وہ جہلمی، مَیں سرگودھوی۔ ہمارا پنجابی کا لہجہ بھی خاصا مماثل تھا اور ہم دونوں جب اختر کے ہاں حاضر ہوتے تھے تو اختر کہتے تھے ''وہ آ گئے میرے طرّے دار دوست !''

یہ آج سے کم و بیش نصف صدی پہلے کا ذکر ہے اور کسی شخص کو پرکھنے کے لیے یہ مدت بہت کافی ہے۔ ضمیر اور مَیں اپنی مصروفیتوں اور دلچسپیوں کے لحاظ سے خاصے دور رہے مگر ہمارے قلب و ذہن کا قرب، جو کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے، ہم دونوں کا عزیز ترین سرمایہ رہا۔ ایسے کھرے سونے کے سے تابندہ اور درخشندہ انسان میرے تجربے میں سے بہت کم گزرے ہیں۔ ننھی ننھی کمزوریاں سبھی میں ہوتی ہیں۔ یہ کمزوریاں ہماری انسانیت کی پہچان ہیں۔ مجھے تو ضمیر کے سے پیارے انسانوں کی کمزوریوں پر بھی پیار آتا ہے۔ مگر ضمیر کا مزاح اور کردار اتنی بہت سی خوبیوں سے لدا پھندا اور بھرا پڑا تھا کہ میں انہیں محبتوں کا کروڑ پتی کہتا تھا۔

محبت اور اپنائیت جیسے ان کی گھٹی میں پڑی ہوں۔ مجھے اُس شخص پر رحم

آتا ہے جسے ضمیر سے تعارف کے بعد ضمیر کی اپنائیت نہ ملی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خود اس کے اندر اس جذبے کا فقدان تھا جس سے ضمیر کا وجود چھلکتا رہتا تھا۔ وہ دو ایک بار متعارف ہونے والوں سے بھی اس قدر قربت کے جذبے سے بات کرتے تھے کہ مخاطب یوں محسوس کرتا تھا جیسے اسے اپنا کوئی کھویا ہوا بھائی مل گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ادبی دنیا میں جو بے شمار حلقے اور گروہ بلکہ فرقے بنے ہوئے ہیں، ان سب میں ضمیر مقبول تھے کہ وہ کسی کا دل نہیں دُکھاتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنی ملازمت کے دوران بھی وہ اس طرح غیر مشروط طور پر ہر دلعزیز رہے ہوں گے۔

ضمیر غضب کے محفل آرا تھے۔ چند لمحوں ہی میں محفل کا محور بن جاتے تھے۔ ان کی باتوں میں اتنی شگفتگی ہوتی تھی کہ ان کی محفل سے مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے، سبھی محظوظ ہوتے تھے۔ وہ لطیفے بازی نہیں کرتے تھے، باتوں باتوں میں لطیفے تخلیق کرتے جاتے تھے۔ اوچھے وار کا بھی وہ اس سلیقے سے جواب دیتے تھے کہ وار کرنے والا بھی ''مشرف بہ ضمیر'' ہو جاتا تھا۔ شاعروں کی ایک پُر ہجوم محفل میں ضمیر شمع محفل بنے بیٹھے تھے جب حضرت حفیظ جالندھری بولے ''ضمیر! یہ تُو نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام ''مافی الضمیر'' کیوں رکھا ہے۔ اس مجموعے کا مناسب نام تو ''بے ضمیر'' تھا۔'' ضمیر فوراً بولے ''قبلہ یہ عنوان بھی میرے ذہن میں آیا تو تھا مگر پھر میں نے سنا کہ آپ اپنی خودنوشت سوانح عمری لکھ رہے ہیں چنانچہ میں نے یہ عنوان اس کے لیے رہنے دیا۔''

اسی طرح ایک مشاعرے میں ضمیر سے ملاقات ہوئی۔ اُن دنوں لاہور میں حضرت حفیظ بیمار تھے۔ ضمیر نے ان کے بارے میں پوچھا تو میں نے بتایا کہ ابھی دو تین روز پہلے میں نے انہیں دیکھا تھا۔ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اس پر ضمیر نے پوچھا ''کہیں وہ اپنی شاعری سے بھی زیادہ کمزور تو نہیں ہو گئے؟''

مدتوں کی جدائی کے بعد جب برسوں پہلے ہم واہ میں کرنل شیر محمد شاد مرحوم کے گھر میں جمع ہوئے تھے اور ہمارے ملک کے ایک ہیرو جنرل عبدالعلی ملک اور دیگر متعدد زعما کی موجودگی میں شعر و شاعری کی ایک محفل آراستہ ہوئی تھی تو میں نے محسوس کیا تھا کہ ماہ و سال نے ضمیر کا کچھ نہیں بگاڑا۔ وہ ماضی کی طرح زندگی کے جوش و جذبہ سے لبالب بھرے ہوئے ہیں۔ وہاں کے دو تین روز کے قیام میں ہم نے اپنی پرانی وابستگیوں کو تازہ کیا تھا اور یہ تازگی یا تازہ دلی آخر تک قائم رہی۔

میری بیٹی ناہید قاسمی نے نظمیں لکھنا شروع کیں تو ''فنون'' کی ہر اشاعت پر انہوں نے اس بچی کو اتنی بہت سی داد بھجوائی کہ اس کی ہمت افزائی کے ساتھ ساتھ خود میرا سینہ بھی کچھ اور فراخ ہوگیا۔ یہ ہمت افزائی ان کی فطرت میں تھی۔

بعد میں جب بیٹی منصورہ احمد کا مجموعۂ کلام شائع ہوا تو ۳۰ جولائی ۱۹۹۸ء کو ضمیر صاحب نے منصورہ کے نام جو خط لکھا وہ ہمت افزائی اور قدردانی کا شاہکار ہے۔ خط کی عبارت یہ تھی:

> ''طلوع'' کا نسخہ بھیجنے کے لیے شکرگزار ہوں۔ کتاب کا چہرہ ہی چوکھا نہیں، اس کی روح بھی بڑی روشن ہے۔ یہ زندگی کو آگے لے جانے والی شاعری ہے۔ ''طلوع'' کی اشاعت کو میں اُردو شاعری کے ایوان میں ایک نئی صبح کا طلوع سمجھتا ہوں۔ تمہارے لہجے میں انسان اور پرندے بہت قریب آ گئے ہیں۔ غزل میں بھی تمہاری بُنت کاری دل موہ لینے والی ہے مگر نظم میں تو فکر و خیال کا ایک شہر سا آباد نظر آتا ہے۔ ہمارا ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا ہے یا نہیں، مگر تم نے اُردو نظم کو یقیناً اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا ہے۔''

خود میرے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے بھی ضمیر صاحب نے محبت سے چھلکتے ہوئے مبالغے سے کام لیا اور فرمایا:

"ندیم صاحب کو تو اس سے کہیں زیادہ بڑے بڑے ---- جلیل و جمیل اعزازات ---- مل سکتے ہیں کہ کوئی ادبی اعزاز ان کی قامت کے برابر نہیں ہے۔ مگر میرے لیے تو اس تقریب کی صدارت، فضیلت مآب ---- کی پاکستان کی صدارت سے کم نہیں۔ چنانچہ اس "تمغۂ ندیم" کے بعد مجھے ادب کے کسی "تمغۂ یتیم" کی ضرورت نہیں۔"

اپنے اسی خطبۂ صدارت میں ضمیر صاحب نے متعدد مقامات پر میری محبت بھری تحسین کی۔ ذیل کی چند سطور محض اس لیے درج کی جا رہی ہیں کہ یہ ضمیر مرحوم کے اعلیٰ معیارِ تنقید کی ایک بھرپور مثال ہے:

"اس کی شاعری زندگی کا دریا ہے جس میں مختلف دھارے، مختلف سطحوں پر، ایک دوسرے کو چھوتے، اوپر اٹھتے، آگے نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کی شاعری میں فکر کی ہمت بھی ہے، اسلوب کی رعنائی بھی اور محنت کی حدت و حرکت بھی، اور اُفق کی وہ بے کناری بھی جو تشنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے آسمان پر ستاروں کا ایک عظیم جھرمٹ دکھائی دیتا ہے مگر ان میں بہت کم ستارے ہیں جو محض حادثاتی طور پر دریافت ہوگئے ہوں۔ ندیم اگلی صبح کا شاعر اور مستقبل کا صورت گر ہے ---- میرے نزدیک وہ ---- اقبال کے بعد ---- ان چند قائدین میں شامل ہے جن کی شاعری میں تاریخ کیا، انسانی تقدیر کے خلاف ایک بڑی طاقتور بغاوت کا شعلہ جلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔"

ان کا ضمیر محبت اور خلوص اور نیک نیتی سے اٹھا تھا۔ دوست یار ان کی شخصیت کو چائے سے تشبیہ دیتے تھے جو ہر موسم میں راحت بخش ہے کہ سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ضمیر کا شمار ان

کامیاب لوگوں میں ہوتا تھا جن کی تعداد ہر زمانے میں بہت کم رہی ہے مگر بطور خاص آج کل تو یہ مخلوق بڑی جستجو کے بعد دستیاب ہو پاتی ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے دنوں میں ضمیر مشرق بعید کے بعض ممالک میں سرکاری فرائض انجام دیتے رہے مگر ان جلی بھنی زمینوں میں بھی ان کا ایک شغف گل چینی کا رہا چنانچہ جب وہاں سے پلٹے تو ''جزیروں کے گیت'' سے لدے پھندے تھے۔ ہمارے کم ہی شعرا نے کسی دوسرے ملک کے حالات و محسوسات کو اپنے فن میں اس کامیابی سے سمویا ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی ضمیر ایک مزاح نگار شاعر کی حیثیت سے ابھرے اور اس شان سے ابھرے کہ شعر میں مزاح کی چاشنی پیدا کرنے والوں میں ان کا نام ہمیشہ صفِ اول میں رہا۔ اچھے مزاح نویسوں میں سے مرزا محمود سرحدی بیشتر قطعات کہتے تھے اور سید محمد جعفری کا کمال معروف شعرا کے بعض اشعار کی منفرد انداز کی پیروڈی تھا۔ دلاور فگار اس وقت تک شاید پاکستان نہیں آئے تھے۔ سید ضمیر جعفری کی مزاحیہ نظمیں فن کے تقاضوں کو ہر طرح پورا کرتی تھیں۔ وہ آغاز ہی میں قاری یا سامع کو اپنی گرفت میں لے لیتی تھیں۔ پھر ان کا ایک باقاعدہ کلائمکس بنتا تھا۔ اور آخر میں ضمیر نظم کو سمیٹتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے ایک بڑے مصور نے اپنے مُوقلم کو ایک آخری حرکت دے کر اور آخری خط لگا کر پوری تصویر میں زندگی اور لطافت کی لہر دوڑا دی ہے۔ وہ اپنے دوسرے معاصرین کی طرح نظم کو ادھورا نہیں چھوڑتے تھے، بلکہ اسے بہرصورت ''وائنڈ اپ'' کرتے تھے چنانچہ ان کی نظم محض ہنسنے ہنسانے کی چیز نہیں ہوتی تھی، باقاعدہ فن پارہ ہوتی تھی۔ ضمیر نے مزاحیہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان میں وہ غزل کی علامتوں اور لفظیات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر شعر میں مزاح کا بھرپور وار کرتے تھے اور اس طرح کے اشعار تخلیق کرتے چلے جاتے تھے:

اس نے کی پہلے پہل پیمائشِ صحرائے نجد
قیس ہے در اصل اک مشہور پٹواری کا نام

پھر ''ولایتی زعفران'' کے نام سے ان کی وہ نظمیں شائع ہوئیں جنہیں وہ انگریزی کی مزاحیہ نظموں کے تراجم کہتے تھے لیکن اگر یہ تراجم ہیں تو ایسے تخلیقی تراجم سے اردو زبان ابھی تک محروم تھی۔

سنجیدہ شاعری میں بھی ضمیر اپنے دور کے کسی بھی بڑے شاعر سے پیچھے نہیں تھے۔ انہوں نے جو نظمیں کہی ہیں ان میں سرزمین پاکستان کی مٹی کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ اپنی نظموں میں اپنے آس پاس کی جزئیات کو سمونے کا جو انداز نظیر اکبر آبادی نے اختیار کیا تھا' اس کی دوسری اہم مثال ضمیر جعفری کی یہ نظمیں ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں آگرہ اور اس کے نواح بولتے تھے۔ ضمیر کی نظموں میں پورے پنجاب کی آڑ میں پورا پاکستان بولتا ہے۔ پھر یہ نظمیں محض قدرتی مناظر کی عکاس نہیں ہیں بلکہ انسان اور فطرت کا ایک خوبصورت ارتباط ان نظموں میں نظر آتا ہے۔

میں نے احباب کی محفلوں میں اکثر کہا ہے کہ جس طرح حالی کی غزل کو ابھی تک ان کے مسدس اور دیگر ''نیچرل'' اور اصلاحی نظموں نے دبا رکھا ہے اسی طرح ضمیر کی غزل (اور نظم بھی) ان کی مزاحیہ شاعری تلے دبی پڑی ہے۔ یہ حادثہ ان سب اہلِ فن پر گزر جاتا ہے جو ایک سے زیادہ اصناف میں تخلیق کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ ضمیر کی غزل نگاری ہی کی دین ہے کہ وہ اتنے بہت سے اصنافِ شاعری میں رواں دواں تھے۔ بہت کم شاعروں نے اس سلیقے کی غزل کہی ہوگی۔ زندگی کے دکھوں اور انسان کی محرومیوں اور اقدار کی پامالی اور معاشرے کی بے حسی اور محبت کی افتاد--- کون سا موضوع ہے جسے ضمیر کی غزل میں جگہ نہیں ملی اور پھر ان موضوعات کو ضمیر نے اتنی استادانہ مہارت سے

برتا کہ کہیں کسی مقام پر پل بھر کو بھی یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ اس دور کے ایک بہت بڑے مزاح نگار شاعر کی غزل ہے۔ البتہ ایک مقام پر انہوں نے اپنی مزاح نگاری کا ایک راز فاش کر دیا۔

کتنے آنسو پی گیا ہوں مسکرانے کے لیے

ضمیر کے اس اعتراف سے اہلِ علم و فن کے اس موقف کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ مزاح نویسی دراصل مزاح نویس کے دکھ درد، محرومی اور اُداسی کا ایک پردہ ہوتی ہے۔

نظم نگاری اور غزل گوئی میں اس مہارت کے علاوہ ضمیر نے ایک اور لحاظ سے بھی اُردو شاعری کو بڑی سربلندی عطا کی۔ یہ پنجابی شاعری کو اُردو شعر میں منتقل کرنے اور پنجابی کی بعض مشہور بحروں میں اُردو شاعری کرنے کا اعزاز ہے۔ اس میدان میں بھی ضمیر منفرد نظر آتے ہیں۔ سید محمد شاہ کے خوبصورت دوہڑوں اور حضرت میاں محمد بخش کے شاہکار ''سیف الملوک'' کے بعض حصوں کو ضمیر نے اُردو شاعری کا جو جامہ پہنایا، اس پر میں بحیثیتِ شاعر رشک بھی کر سکتا ہوں۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا کہ اگر سید محمد شاہ اور میاں محمد بخش اُردو میں شاعری کرتے تو یہ شاعری، اس شاعری سے کیسے مختلف ہوتی جس میں ضمیر نے ان کے کلام کو منتقل کیا۔

ضمیر نے اخبار نویسی بھی کی۔ وہ کالم نگاری کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے معاصرین کے نہایت شگفتہ اور دلچسپ اور سچے خاکے بھی لکھے اور اپنی کردار نگاری کا لوہا منوا لیا۔ میں نے سنا ہے کہ وہ ایک ناولٹ بھی لکھ چکے تھے یا لکھ رہے تھے۔ اسے پڑھے بغیر میں آنکھیں بند کر کے یہ اعلان کرنے کو تیار ہوں کہ یہ ناولٹ بھی ان کی سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری اور شعری تراجم کی طرح کامیاب اور دل و دماغ کو گرفت میں لے لینے پر قادر ہوگا۔

ان کی جملہ تخلیق کاریوں پر وطن کے لیے ان کی نغمہ نگاری مستزاد ہے۔ ''زیورِ وطن'' کے نام سے ان کا جو مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے اسے ہمارے اسکولوں میں بطورِ نصاب شامل ہونا چاہیے کہ وطن سے غیر مشروط محبت کے یہ دلآویز نغمے یک جا اور کہیں نہیں ملیں گے۔

یہ تھے ہمارے شاعر اور مزاح نگار اور کالم نویس اور اخبار نویس اور مترجم اور کردار نگار اور محفل آرا اور جانِ انجمن سیّد ضمیر جعفری، جنہیں ایک نظر دیکھ کر بھی کچھ اور زندہ رہنے کو جی چاہتا تھا کہ زندگی کا حُسن اور محبت اور گہما گہمی اور شگفتگی اس ایک شخص میں مجسّم ہو کر رہ گئی تھی۔ ضمیر محبتوں کا کروڑ پتی بھی تھا اور تخلیقی صلاحیتوں کا جزیرہ بھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جنت الفردوس میں مقیم ہوگا۔

سیّد امتیاز علی تاج

سید امتیاز علی تاج مرحوم سے میرا تعارف اُس زمانے میں ہوا جب میں ۱۹۳۵ء میں گریجویشن کے بعد لاہور میں بے روزگاری کے دن گزار رہا تھا اور یہ بے روزگاری آج کی طرح اُس زمانے میں بھی متوسط طبقے کا مقدر تھی۔ اُن سے ملاقات سے پہلے میں ان کے ڈرامے ''انارکلی'' کے علاوہ ''چچا چھکن'' اور کئی مغربی افسانوں کے تراجم پڑھ چکا تھا۔ میرے ادبی سفر کا آغاز تھا اس لیے ظاہر ہے کہ میں اُس دور کی ایک معروف ادبی شخصیت کے دبدبے کی زد میں بھی تھا۔ البتہ میرے پیر و مرشد مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے امتیاز صاحب کے ساتھ میری پہلی ملاقات کا مرحلہ آسان بنا دیا۔ سالک صاحب، ہی مجھے دارالاشاعت پنجاب کے دفتر میں امتیاز صاحب کے پاس لے گئے اور ان سے ہفتہ وار ''تہذیبِ نسواں'' کے لیے بعض نسوانی انگریزی رسائل کی کہانیوں اور مضامین کے ترجمے کا کام لے دیا۔ میں ہفتے عشرے کے بعد کوئی ترجمہ مکمل کر کے امتیاز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ وہ اسے ایک نظر دیکھتے اور پھر فوری طور پر معاوضے کا بندوبست کر دیتے۔ ان رسمی اور کاروباری ملاقاتوں کے دم سے میرا پہلا تاثر تو یہ تھا کہ امتیاز صاحب خوب صورت آدمی ہیں اور خوب صورت باتیں

کرتے ہیں۔ اس حقیقت کا علم مجھے کچھ عرصہ بعد ہوا کہ امتیاز صاحب کے ظاہر کی طرح ان کا باطن بھی خوب صورت ہے اور ان کی شخصیت تہذیب اور شائستگی کے علاوہ خوش مزاجی اور شگفتگی کا ایک دلآویز امتزاج ہے۔

اسی دوران میں میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''چوپال'' بھی امتیاز صاحب کے ادارے دارالاشاعت پنجاب ہی کی طرف سے شائع ہوا۔

۱۹۳۱ء میں اپنی پہلی نظم کی اشاعت اور ۱۹۳۹ء میں اپنی پہلی کتاب کی اشاعت پر مجھے بے پایاں مسرت کا وہ تجربہ حاصل ہوا جو نئے اہلِ قلم کے حوصلے و ہمت کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ ''چوپال'' خاصے اہتمام سے شائع ہوئی تھی۔ سالک صاحب نے اس کا تعارف اور امتیاز صاحب نے اس کا مختصر سا دیباچہ لکھا۔ اس دیباچے کے ایک جملے کا مفہوم مجھے آج بھی ازبر ہے کہ ''ندیم قاسمی کی اس ابتدائی کوشش کو دیکھ کر ہر پڑھنے والے کو بے اختیار اس امر کا احساس ہوگا کہ اُردو ادب مستقبل کے ایک بڑے مصنف سے روشناس ہو رہا ہے۔'' یہ بحث دوسری ہے کہ میں امتیاز صاحب کی اس پیش گوئی کو صحیح ثابت کر سکا ہوں یا نہیں لیکن اس ایک جملے میں خود امتیاز صاحب کی بڑائی یقیناً جھلک رہی ہے۔

۱۹۳۹ء میں مجھے ایک ایسی سرکاری ملازمت مل گئی جس کا علم و ادب سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ میں نے ملازمت کے یہ دو ڈھائی برس انتہائی بے چینی اور کرب میں بسر کیے۔ مولانا سالک کو اس کا علم تھا کیونکہ وہی میری فریاد گاہ تھے اور میں انھی کے سامنے کھل کر رو پیٹ سکتا تھا۔ وہ میری ہمت بندھاتے اور تسلیاں دیتے رہے اور آخرکار ایک خوشگوار صبح کو مجھے ان کی طرف سے دعوت موصول ہوئی کہ لاہور آ کر ہفتہ وار ''تہذیبِ نسواں'' اور ہفتہ وار ''پھول'' کی ادارت سنبھال لو۔ میں مستعفی ہو کر ملتان سے بھاگا اور ۱۹۴۲ء میں

دارالاشاعت پنجاب سے منسلک ہوگیا۔ اس طرح بعد کے قریب قریب چار سال میں نے امتیاز صاحب کے ہمراہ بسر کئے اور اس دوران میں مجھے ان کی شخصیت کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

یہاں ایک دلچسپ صورتِ حال کی وضاحت ضروری ہے کہ جب میں دارالاشاعت میں پہنچا' تو ایک دو دنوں کے اندر مجھے اندازہ ہوگیا کہ سارا عملہ امتیاز صاحب سے محبت کرتا ہے اور ان کے بڑے بھائی سید حمید علی سے ڈرتا ہے' چنانچہ عملے کو موسمِ گرما کا شدید انتظار رہتا تھا جب سید حمید علی گرمیاں گزارنے سری نگر چلے جاتے تھے اور دارالاشاعت کا انتظام امتیاز صاحب کے سپرد ہو جاتا تھا۔

''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' پر ایڈیٹر کی حیثیت سے نام امتیاز صاحب ہی کا چھپتا تھا۔ شروع شروع میں تو انہوں نے میرے مرتب کئے ہوئے پرچے ناقدانہ نگاہ سے پڑھے مگر اس کے بعد تین ساڑھے تین برس میں مجھے کوئی بھی ایسا موقع یاد نہیں جب انہوں نے میرے اندازِ ترتیب پر نکتہ چینی کی ہو یا مندرجات میں سے کسی ایک کو بھی قابلِ اعتراض ٹھہرایا ہو۔ صرف ''تہذیب نسواں'' کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لیے وہ اس میں کبھی کبھار کوئی بحث چھیڑنے کے سلسلے میں مجھ سے گفتگو کرتے تھے۔ اس بحث کا آغاز کبھی کبھی میری طرف سے مگر عموماً انھی کی طرف سے ہوتا تھا۔ اِدھر مضمون چھپتا تھا اُدھر بحث میں حصہ لینے والی خواتین کے مضامین کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔ پھر جب یہ بحث سرد پڑنے لگتی تھی تو ہم بحث کا کوئی نیا موضوع سوچتے تھے اور ایک بار پھر تائید و اختلاف سے بھرے ہوئے مضامین کا تانتا بندھ جاتا تھا۔ انھی دنوں کا واقعہ ہے کہ میں نے ایک بحث کا آغاز کیا۔ امتیاز صاحب کی ایک رشتہ دار خاتون لاہور ہی میں مقیم تھیں۔ شاید ان کا نام سلطانہ قاضی تھا۔ اچھے افسانے لکھتی تھیں

جو رسالہ ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے اختلاف کا اظہار کیا۔ ان کا مضمون درج کرنے کے بعد اگلے ہفتے میں نے اس کا جواب لکھا۔ جس روز پرچہ بازار میں آیا مجھے امتیاز صاحب نے اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔ وہاں سلطانہ صاحبہ بھی موجود تھیں۔ تعارف کرایا اور ایک بلیغ مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا کہ انہیں آپ سے کچھ کہنا ہے۔ وہ غصے میں بھری بیٹھی تھیں۔ ٹوٹ پڑیں۔ میں نے عرض کیا کہ کیا بہتر یہ نہیں ہوگا کہ ہم صرف تہذیب نسواں کے صفحات پر لڑیں۔ اس پر وہ کڑک کر بولیں ''تو کیا میں لڑ رہی ہوں؟'' میں نے امتیاز صاحب کی تائید حاصل کرنے کے لیے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تو لڑائی اور کسے کہتے ہیں؟'' اور امتیاز صاحب بولے ''نہیں میرے خیال میں یہ لڑائی نہیں ہے۔ یہ تو ایک طرح کا تبادلۂ خیالات ہے۔ لڑائی کی صورت تو اُس وقت پیدا ہوتی جب سلطانہ کرسی اٹھا کر آپ کے دے مارتیں اور ابھی انہوں نے کرسی کی طرف تو ہاتھ بڑھایا ہی نہیں۔'' اس پر مَیں مسکرایا مگر سلطانہ ایک دم اس زور سے رونے لگیں کہ ملحقہ کمروں میں بیٹھے ہوئے اہل کار بھی چونک پڑے۔ امتیاز صاحب نے مشکل سے انہیں خاموش کرایا۔ میں نے بھی معذرت کی تو وہ بولیں ''تو آپ وعدہ کر رہے ہیں کہ آپ آئندہ میرے ساتھ بحث میں نہیں الجھیں گے۔'' میں نے عرض کیا کہ میری معذرت کا مطلب آپ غلط سمجھیں۔ میں نے تو معذرت کا لفظ اس لیے استعمال کیا تھا کہ اگر اس گفتگو میں مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجئے۔ رہی بحث تو وہ تو جاری رہے گی۔ میں تو یہ کہنے کے بعد سلطانہ صاحبہ کی طرف دیکھے بغیر بھاگ آیا' مگر بعد میں امتیاز صاحب نے میرے کمرے میں آ کر مجھے مبارک باد دی کہ میں نے ایک اچھے ایڈیٹر کا طرزِ عمل اختیار کیا۔

ایک دن مشہور افسانہ نگار اور میرے عزیز دوست کرشن چندر تشریف

لائے۔ وہ اُن دنوں ''نئے زاویے'' کی پہلی جلد مرتب کر رہے تھے۔ انہیں اس مجموعے کے لیے امتیاز صاحب کے ڈرامے کی ضرورت تھی مگر وہ امتیاز صاحب سے متعارف نہیں تھے اس لیے انہوں نے میرا توسط اختیار کیا۔ میں نے جب امتیاز صاحب کو بتایا کہ کرشن چندر آپ سے ملنے آئے ہیں تو انہوں نے اتنی مسّرت کا اظہار کیا کہ میں حیران رہ گیا۔ کچھ لکھ رہے تھے مگر قلم رکھ کر کھڑے ہوگئے۔ ''کہاں ہیں کرشن چندر! بلائیے انہیں۔ پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ انہیں ساتھ ہی کیوں نہیں لے آئے؟'' میں کرشن چندر کو لے آیا تو امتیاز صاحب ان سے اتنی محبت اور اپنائیت سے ملے کہ کرشن کا ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ میں نے ہی امتیاز صاحب سے کرشن چندر کی آمد کا مقصد بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ ''نئے زاویے'' کے لیے ڈرامہ ضرور لکھیں گے۔ اس کے بعد وہ کرشن کے افسانوں کی تعریف کرنے بیٹھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک ندی ہے جو گلپوش جھاڑیوں سے لدی ہوئی ایک وادی میں حدِ نظر تک بہے جا رہی ہے۔ ادبی اور فنی موضوعات پر امتیاز صاحب اتنی روانی سے بولتے تھے اور بولتے چلے جاتے تھے کہ ان کے شوق کی بے ساختگی اور ان کے مطالعے کی وسعت پر حیرت ہوتی تھی۔ آخر ہم ان سے رخصت ہوئے۔ کرشن چندر میرے ہمراہ میرے کمرے میں آ کر بیٹھے تو کیا' کرسی پر گر پڑے اور بولے ''یار ندیم! جلدی سے ایک گلاس پانی پلاؤ' بلکہ دو گلاس منگاؤ' ایک گلاس پلاؤ اور ایک گلاس میرے سر پر انڈیل دو۔ میں تو چکرا کر رہ گیا ہوں۔ یار حد ہوگئی۔ ہم اُردو کے افسانہ نگار کہلاتے ہیں۔ اُردو روانی سے لکھتے ہیں مگر اُردو کا ایک جملہ بولنا پڑے تو جگہ جگہ رکتے ہیں۔ اور ادھر سیّد امتیاز علی تاج ہیں کہ اُردو بولنے لگے تو بولتے ہی چلے گئے۔ یار ایک بات کہوں۔ سید امتیاز علی تاج کو کتنی اچھی اور کتنی بہت سی اُردو آتی ہے!'' ---- بعد میں جب میں نے امتیاز صاحب کو کرشن کے اس ردِعمل سے

مطلع کیا تو خوب ہنسے اور مجھ سے کہا "کرشن سے پھر ملیں تو ان سے کہئے گا کہ اُردو کے معاملے میں ہمارا پلّہ کسی صورت میں بھاری نہیں ہے۔ ہم لوگ اہل زبان ہیں، تو آپ لوگ اہلِ بیان ہیں!"

امتیاز صاحب کی زندہ دلی اور شگفتہ طبعی کا ایک اور واقعہ سنیے۔ میرے کمرے میں دو خوش نویس بھی کام کرتے تھے۔ رام پور کے منشی تہوّر علی "تہذیب نسواں" کی کتابت کرتے تھے اور منشی فرزند علی جو موچی دروازے کے باشندے تھے، سالہاسال سے "پھول" کی کتابت کر رہے تھے۔ منشی تہوّر علی شمس العلما سید ممتاز علی مرحوم کے زمانے سے دارالاشاعت میں کتابت کر رہے تھے۔ منشی فرزند علی شوخ اور ہنس مکھ تھے۔ ان کے مقابلے میں منشی تہور علی ہمہ وقت پان کھاتے رہتے تھے اور کھل کر شاید اس لیے نہیں ہنستے تھے کہ پان کی پیک ان کے منہ میں چلّوؤں کے حساب سے جمع رہتی تھی۔ پھر جب وہ کھڑکی میں سے باہر اس پیک کو تھوکتے تھے تو جو آواز پیدا ہوتی تھی، اس سے متاثر ہو کر سالک صاحب نے منشی تہور علی کا نام "منشی تھور علی" رکھ دیا تھا۔

منشی فرزند علی کو کچھ پیشگی رقم کی ضرورت پڑی۔ سیّد حمید علی کشمیر گئے ہوئے تھے۔ چارج امتیاز صاحب کے پاس تھا۔ منشی فرزند علی ہیڈ کلرک کے پاس گئے جس نے یہ کہہ کر پیشگی دینے سے انکار کر دیا کہ "سید حمید علی صاحب کا حکم ہے کہ مہینے کی دسویں سے پہلے کوئی تنخواہ، کوئی پیشگی نہیں دی جا سکتی اور میں حکم کا بندہ ہوں۔" منشی فرزند علی نے منتیں کیں کہ ضرورت شدید ہے، مہربانی کیجئے، مگر ہیڈ کلرک نے ایک ہی رٹ لگائے رکھی کہ میں تو حکم کا بندہ ہوں۔ اس پر منشی فرزند علی نے تنگ آ کر موچی دوازے کی زبان میں کہا "نہیں، تم حکم کے بندے نہیں ہو۔ تم تو چڑیا کے غلام ہو۔" آس پاس بیٹھے ہوئے کلرک ہنسی پر ضبط نہ کر سکے اور ہیڈ کلرک غصّے سے پاؤں پٹختا ہوا امتیاز صاحب کے کمرے کی طرف لپکا۔

کچھ دیر کے بعد امتیاز صاحب کی طرف سے منشی فرزند علی کا اور میرا بلاوا آیا۔ ہم گئے تو امتیاز صاحب نے منشی فرزند علی کو خلافِ معمول ذرا سختی سے مخاطب کیا اور کہا ''اگر آپ دفتر کے اہل کاروں میں اس طرح خطابات تقسیم کرنے لگے تو دفتر کے نظم و ضبط کا بیڑا غرق ہو سکتا ہے۔ آخر وہ ہیڈ کلرک ہے۔ اور کچھ نہیں تو اُس کے عہدے ہی کا لحاظ کر لیا ہوتا۔ آپ تشریف لے جایئے۔'' منشی فرزند علی چلے گئے تو امتیاز صاحب نے انہیں کچھ دیر تک جاتے دیکھا۔ پھر میری طرف پلٹے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہنسی پر ضبط نہیں کر پا رہے ہیں مگر ان کے لیے مزید ضبط کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ خوب ہنسے اور کہنے لگے ''اب کیا کیا جائے۔ ہیڈ کلرک نے اپنی مونچھیں یوں نیچے لٹکا رکھی ہیں کہ اسے چڑیا کے غلام سے زیادہ اور کیا اعزاز دیا جا سکتا ہے۔ میں آپ کے کاتب کی قوتِ مشاہدہ کی داد دیتا ہوں۔''

''تہذیبِ نسواں'' کے کاتب منشی تہور علی رام پوری کسی زمانے میں اچھے کاتب ہوں گے مگر اب وہ خوش نویسی کی منزل سے آگے نکل گئے تھے۔ پھر وہ بہت تنک مزاج تھے۔ دارالاشاعت کے ساتھ سالہا سال کی وابستگی ان کا واحد ''سٹرانگ پوائنٹ'' تھا اور ادارے کے مالک انہیں شمس العلما سید ممتاز علی مرحوم کی نشانی کے طور پر برداشت کیے جا رہے تھے۔ ایک روز میں دفتر پہنچا تو منشی صاحب کو سخت تاؤ میں دیکھا۔ معلوم ہوا کہ امتیاز صاحب کے بعض عزیزوں نے انہیں چھیڑا ہے اور ان کے ساتھ کوئی مذاق کیا ہے۔ انہوں نے ایک درخواست میرے ہاتھ میں تھما دی۔ یہ ان کا استعفیٰ تھا۔ میں نے بڑے ادب سے عرض کیا کہ اپنے واحد روزگار کو اس بے نیازی سے ٹھوکر نہ ماریے۔ مگر وہ بضد رہے کہ ان کا استعفیٰ منظور ہونا چاہیے۔ لاچار میں امتیاز صاحب کے پاس گیا اور منشی تہور علی کے استعفیٰ کی درخواست ان کے سامنے رکھ دی۔ انہوں نے درخواست پڑھی اور بولے ''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ منشی صاحب نے ازخود تشریف

لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں یہ استعفیٰ بخوشی منظور کرتا ہوں۔'' انہوں نے یہ آخری جملہ درخواست پر لکھا اور دستخط کر دیے۔ میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور جب منشی صاحب کو بتایا کہ آپ کا استعفیٰ منظور ہوگیا ہے تو انہوں نے جیسے چیخ ماردی۔ ''منظور ہوگیا؟'' وہ ایک دردناک حیرت سے بولے اور پھر جیسے ان پر سکتہ طاری ہوگیا۔ میں نے اور منشی فرزند علی نے انہیں دلاسا دیا' پانی پلایا اور جب وہ بولنے لگے تو ساتھ ہی رونے بھی لگے ''یہ معاوضہ ملا ہے ہمیں ساری عمر اس ادارے کے لیے وقف کر دینے کا۔ سبحان اللہ ! کیا قدر دانی ہے ! کیا جوہرشناسی ہے !'' میں انہیں اسی حالت میں چھوڑ کر سالک صاحب کی طرف بھاگا' ان کا دفتر قریب ہی خالصہ سٹریٹ میں تھا۔ انہوں نے سنا تو بے حد اُداس ہوگئے۔ چھڑی اٹھائی' مجھے ساتھ لیا' سیدھے امتیاز صاحب کے کمرے میں گئے اور ان پر ایسے برسے کہ خدا کی پناہ۔ امتیاز صاحب معذرت کرتے رہے اور کہتے رہے ''نہیں سالک صاحب! میں نے تو ان سے محض دل لگی کی ہے ورنہ میں انہیں کیسے جانے دوں گا۔'' پھر مجھ سے استعفیٰ کی درخواست لے کر پرزے پرزے کر دی۔ منشی تہور علی کو بلایا اور ان سے باقاعدہ معافی مانگی۔

امتیاز صاحب کے مزاج اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس طرح کے بے شمار واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں مگر سبھی کو دہرانا ممکن نہیں۔ آخر میں صرف ایک واقعہ سن لیجئے۔ ''تہذیب نسواں'' میں کبھی نذر سجاد حیدر صاحبہ اور کبھی حجاب امتیاز صاحبہ کے روزنامچے شائع ہوا کرتے تھے۔ ایک روز سالک صاحب میرے پاس بیٹھے ''تہذیب نسواں'' کا نیا شمارہ دیکھ رہے تھے جب حجاب صاحبہ کا روزنامچہ پڑھتے ہوئے اچانک چونکے اور چپڑاسی سے کہا کہ امتیاز صاحب کو بلا لاؤ۔ امتیاز صاحب میرے کمرے میں پہنچے تو سالک صاحب نے چھوٹتے ہی کہا ''حجاب بی بی سے کہئے روزنامچہ لکھا کریں تو سچ بولا کریں۔ روزنامچے میں افسانہ

نگاری نہیں چلتی۔'' امتیاز صاحب نے تعمیل ارشاد کا وعدہ کیا اور اس مشورے کی وجہ پوچھی تو سالک صاحب بولے ''یہ دیکھیے' لکھا ہے کہ سالک صاحب ہم سے ملنے آئے تو اُس وقت میں اپنی دریچی میں کھڑی دریچی پر پھیلی ہوئی پھولوں لدی بیل کی جھریوں میں سے غروبِ آفتاب کا منظر دیکھ رہی تھی۔ حالانکہ جب میں پہنچا تھا تو وہ اپنے طوطے کو چُوری کھلا رہی تھیں۔'' بس کچھ نہ پوچھیے کہ سالک صاحب کے اس ارشاد پر امتیاز صاحب کتنی بے اختیاری سے کتنا بہت سا ہنسے۔ یہ ان کی فراخ دلی' بزرگ دوست کے احترام اور شگفتہ مزاجی کا ایک ننھا سا ثبوت ہے۔

ان کے ادب وفن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا اور لکھا جانا چاہیے۔ مجھے مختصراً صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اعلیٰ معیار کے ایک ڈرامے کے مصنف اور ریڈیو ڈراموں کے ایک بے مثال صداکار ہونے کے علاوہ امتیاز مرحوم نے اُردو ڈرامے پر اور بھی بہت سے احسانات کیے ہیں۔ انہیں احساس تھا کہ قدیم اُردو ڈراموں کا کوئی بھی مستند ایڈیشن دستیاب نہیں ہے اور نہ ہی اُردو میں ڈرامہ نویسی پر کوئی معقول کتاب موجود ہے' چنانچہ انہوں نے لکھنؤ کی اندرسبھا اور بمبئی کے ناٹکوں سے لے کر آغا حشر اور ان کے بعد کے ڈراموں کو مرتب اور طبع کرنے کا ایک عظیم الشان منصوبہ بنایا جسے مجلس ترقی ادب نے اپنے طباعتی پروگرام میں شامل کر لیا۔ بعد میں خود امتیاز مرحوم' مجلس ترقی ادب کے ناظم مقرر ہوگئے' چنانچہ ان کی نگرانی میں ان ڈراموں کے مستند نسخوں کی فراہمی اور ترتیب و اشاعت کا کام شروع کیا گیا۔ ان ڈراموں پر امتیاز مرحوم نے بڑی محنت کی اور ان کے لیے معلومات افزا اور عالمانہ دیباچے لکھے۔ ان کے بے وقت انتقال کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور ڈراموں کی چند اور جلدیں شائع ہوئیں۔ پروفیسر سید وقار عظیم مرحوم نے کام کو کسی حد تک آگے بڑھایا مگر پھر وہ بھی وفات پا گئے

اور ڈراموں کی طباعت میں عارضی طور پر رکاوٹ پیدا ہوگئی مگر اب ڈراموں کی طباعت کے اس کام کا احیا ہو چکا ہے اور آغا حشر کے ڈراموں کے مجموعے اور رفیع پیر کے ڈرامے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اب تک ڈراموں کی جو پندرہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے بیشتر اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں، بمبئی، کلکتہ، لکھنؤ اور لاہور وغیرہ میں سٹیج ہو چکے تھے۔ ان میں خورشید، آرام، ظریف، رونق، حباب، حافظ عبداللہ، کریم الدین مراد، طالب بنارسی، آغا حشر اور رفیع پیر کے علاوہ ''نامعلوم مصنفین'' اور ''متفرق مصنفین'' کے ڈرامے شامل ہیں۔

اُردو ادب میں امتیاز مرحوم کی طرف سے یہ بہت بڑا اضافہ ہے۔ ادبی اعتبار سے ان ڈراموں کی اہمیت زیادہ نہ سہی مگر تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت ہے۔ اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُردو کا دامن ڈرامے سے خالی ہے۔

امتیاز مرحوم کے ادب وفن کی صحیح تحسین کا کام ابھی شروع ہی نہیں ہوا۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ڈرامے کے فن سے بھی آشنا ہوں اور مجھ سے کہیں زیادہ مرحوم کے قریب بھی رہ چکے ہوں۔ شرافت، تہذیب، شائستگی اور خوش مزاجی کا یہ مرقع جس طرح اس دُنیا سے رخصت ہوا وہ ہم سب کے لیے دردناک بھی ہے اور شرمناک بھی۔ میں نے ان کی موت کی خبر سنی تھی تو کچھ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے شگفتگی کی انتہا پر پہنچے ہوئے ایک پھول کو مسل ڈالا گیا ہے۔

حکیم محمد سعید

محترم حکیم محمد سعید صاحب کی سی کثیر الجہات شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا' مہذب انسانوں کی معاشرتی سرگرمیوں کی جتنی بھی جہات ہوسکتی ہیں' ان سب کو حیطۂ تحریر میں لانے کے برابر ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ یہ ناممکنات کی حد تک دشوار کام ہے۔ ظاہر ہے کہ حکیم صاحب صرف ایک شخص' صرف ایک ذات' صرف ایک فرد ہیں مگر مشکل یہ ہے ان کی صرف ایک یا دو یا دس سرگرمیوں کا ذکر کیجیے تو ان کی بیسیوں دوسری سرگرمیاں تشنۂ توجہ رہ جاتی ہیں اور یوں اس ایک فرد کے پھیلاؤ کو سمیٹنا' کم سے کم میرے لیے نہایت درجہ دشوار ہے' چنانچہ میں ان کی اِکا دُکا سرگرمیوں کا ذکر کروں گا اور یوں آج ان کے بارے میں مجھے کچھ عرض کرنے کا جو اعزاز بخشا گیا ہے' اس کے جواز کی کوئی صورت پیدا کروں گا۔

دشواری یہ ہے کہ معاشرے کی بہبود اور عالمِ انسانیت کی فلاح کے چیلنج تو تاریخِ انسانی میں بے شمار اصحاب نے قبول کیے ہیں مگر ان سب کی فلاحی جدوجہد کسی ایک شعبے میں محدود ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے آپ کو کوڑھیوں کے علاج اور دیکھ بھال کے لیے وقف کر دیتا ہے تو یہ انتہائی نیک کام

ہے اور اس ضمن میں اس شخص کی بھرپور تحسین ہونی چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی جدوجہد ایک دائرے میں محدود ہے۔ مگر جو شخص ایک اعلیٰ پائے کا تجربہ کار معالج ہونے کے ساتھ ہی علم و حکمت' تہذیب و ثقافت' تعلیم و تربیت اور کردار و اخلاق کے شعبوں کو بھی اپنی سرگرمیوں میں شامل کرتا ہو اور ان شعبوں کی فلاح کی انتہا کر دیتا ہو' مگر ساتھ ہی طبابت کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے جاری رکھتا ہو' اور جو کروڑوں اربوں روپے کمانے کے باوجود نہایت درجہ سادہ زندگی گزارتا ہو' اور جو بچوں کے لیے لکھی ہوئی ڈائری میں خود بتاتا ہو کہ ----'' میں تو اپنی شیروانی اور کرتا پاجامہ بھی خود ہی دھو لیتا ہوں' اپنا بنیان اور اپنے موزے خود دھو کر ڈال دیتا ہوں' صبح میں اپنا غسل خانہ روزانہ خود ہی صاف کرتا ہوں اور ہر چیز چمکا کر آئینہ بنا دیتا ہوں'' تو ایسا شخص ایک فرد کہاں ہوا' وہ تو اپنی ذات میں ایک ادارہ ہے اور ایک وسیع اور بھرپور ادارے کے خدوخال کو چند سطور میں بیان کرنے کے لیے دانش وحکمت کی وہ قوتیں درکار ہوتی ہیں جو میرے خیال کے مطابق مجھ میں کماحقہٗ موجود نہیں ہیں۔

محترم حکیم محمد سعید صاحب کی تاریخ پیدائش ۹۔ جنوری ۱۹۲۰ء ہے چنانچہ جب آزاد پاکستان وجود میں آیا تو وہ چھبیس ستائس برس کے ایک ایسے نوجوان تھے جنہیں ہر طرح کی آسائش میسر تھی اور دولت و ثروت ان کے گھر کی باندیاں تھیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ پاکستان سے محبت ان کے جسم میں خون کی طرح رواں تھی چنانچہ وہ یہ سب دولتیں اور آسائشیں تج کر پاکستان آ گئے۔

کراچی میں اعوان لاج کے ایک چھوٹے سے کمرے میں انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا (چلتے چلتے مجھے اس امر پر خوش ہو لینے دیجیے کہ میں اعوان ہوں اور محترم حکیم صاحب کا آغازِ کار اعوان لاج سے وابستہ ہے) پھر آرام باغ روڈ کے ایک کمرے میں انہوں نے ہمدرد مطب قائم کیا۔ کمرہ بھی

کرائے کا تھا اور اس کا فرنیچر بھی کرائے کا تھا اور یاد رہے کہ یہ اس شخص کی اقامت گاہ تھی جو دہلی میں امارت کی اونچی مسند چھوڑ کر آیا تھا۔ یہ ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے اور پھر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ یہ مطب اگرچہ ایک فردِ واحد کی ملکیت تھا مگر اس عجیب وغریب فرد واحد نے چار پانچ سال بعد ہی ۱۹۵۳ء میں مطب کو وقف قرار دے دیا اور یوں اپنا سب کچھ قوم کے سپرد کردیا۔ تب سے اب تک کی داستان بہت طویل ہے مگر یہ ایک ایسی داستان ہے جس کی گزشتہ چند صدیوں کی تاریخ میں نظیر پیش کرنا مشکل ہے۔

آج مدینتہ الحکمت اس عظیم خواب کی ہمہ گیر تعبیر کی صورت میں سرزمین کراچی سے ابھرا ہے' جو محترم حکیم محمد سعید صاحب نے کراچی میں قیام کے ابتدائی دنوں میں کرائے کے کمرے اور کرائے کے فرنیچر کے ماحول میں دیکھا تھا۔ یہ سارا کمال ان کی جرأت اور حوصلہ مندی کا ہے' ان کی تہذیب اور شائستگی کا ہے' ان کی دیانت اور خوداعتمادی کا ہے' ان کے پاکیزہ مقاصد اور ان کی محیرّ العقول اور اَن تھک محنت کا ہے۔ محنت اور مسلسل محنت نے محترم حکیم محمد سعید صاحب کے وجود میں تجسیم پائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت قائداعظم نے جب قیام پاکستان کے دنوں میں نئی پاکستانی قوم کے سامنے کام' کام اور زیادہ کام' کا نعرہ سر کیا تھا تو حکیم صاحب نے اسے اپنے باطن میں اتار لیا تھا چنانچہ انہوں نے اتنی محنت کی ہے اور آج ۷۴ برس کی عمر میں بھی اسی معیار کی محنت کر رہے ہیں کہ ہما شما ایسی کارکردگی کا تصور بھی کریں تو ان کے دماغ کی نسیں پھٹنے پر آجائیں۔

اپنی ذات کی نفی کرکے دوسروں کے لیے اپنی محنت اور لگن کی کمائی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وقف کر دینا' انسانی حقوق کے پاس و احترام کا ایک معجزہ ہے جو محترم حکیم محمد سعید صاحب نے حیرت انگیز استقامت سے سَر کیا ہے۔ طبابت کا

سلسلہ ان کی جملہ دیگر سرگرمیوں کے باوجود باقاعدگی سے اب تک جاری ہے چنانچہ وہ اب تک تیس لاکھ مریضوں کا علاج فرما چکے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ مفت طبی مشورہ دیا ہے اور ہمارے ایلوپیتھک متخصصین کی طرح تین منٹ کے مشورے کے تین تین سو اور چھ چھ سو روپے مریضوں سے کبھی نہیں اینٹھے۔ حد یہ ہے کہ انہوں نے وفاقی حکومت کا وزیر ہونے کے دنوں کے علاوہ صوبہ سندھ کی گورنری کے دنوں میں بھی پاکستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں مریضوں کو نہایت شفقت سے مشورے دیے اور علاج تجویز کرنے کا کام باقاعدگی سے جاری رکھا۔

اللہ تعالیٰ نے حکیم صاحب موصوف کو کامرانیوں پر کامرانیاں عطا کی ہیں۔ قدم قدم پر انہیں ان کے ہر خواب کی تعبیر مل رہی ہے۔ ایک ایک کر کے بظاہر ان کے سبھی خواب پورے ہو چکے ہیں اور اب ان خوابوں کی تکمیل کا سلسلہ جاری ہے۔ اس وقت وہ ہمدرد فاؤنڈیشن کے صدر ہیں۔ ہمدرد یونیورسٹی کے بانی چانسلر ہیں۔ ہمدرد لیبارٹریز کے بانی، صدرنشین ہیں۔ چالیس کے قریب اُردو کتابوں کے اور تیس کے قریب انگریزی کتابوں کے مصنف اور مرتب ہیں۔ ان کی ذاتی لائبریری پچاس ہزار کتابوں پر مشتمل ہے اور اب انہوں نے اپنی یہ لائبریری ہمدرد یونیورسٹی لائبریری کے حوالے کر دی ہے۔ اس لائبریری کے لیے اب تک ساٹھ لاکھ روپے کی کتابیں خریدی جا چکی ہیں۔

انہوں نے مدینتہ الحکمت کے نام سے تہذیب و ثقافت اور علم و فن کا پورا شہر بسا دیا ہے اور اس مفروضے کی عملاً تنسیخ کر دی ہے کہ:

بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے

انہوں نے تو یہ بستی بسانا اِدھر طے کیا اُدھر بستی زمین کے سینے میں سے کھمبیوں کی طرح اُگ آئی۔ اس مدینتہ الحکمت میں ہمدرد پبلک سکول ہے جس میں بیک وقت پانچ ہزار بچے تعلیم پاتے ہیں۔ دو ہزار بچوں کے لیے یتیم خانہ الفرقان

ہے۔ دس ہزار طلبا پر مشتمل ہمدرد یونیورسٹی ہے۔ ہمدرد میڈیکل کمپلیکس ہے۔ ہمدرد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہے جس میں پودوں اور جڑی بوٹیوں کے خواص کی تحقیق کا کام جاری رہتا ہے۔ سائنس میوزیم ہے۔ سپورٹس سٹیڈیم ہے ۔ بچوں کا پلے لینڈ ہے۔ یوتھ سنٹر ہے۔ ہمدرد لائبریری ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ہمدرد طبیہ کالج ہے۔ ہر قوم کے محققین کی سہولت کے لیے آرام دہ رہائش گاہیں تعمیر ہو چکی ہیں' اور یہ سب ادارے رنگ' نسل اور نظریہ وعقیدہ سے ماوراء عالمِ انسانیت کے لیے وقف ہیں۔ حکیم صاحب ۷۵ غیر ملکی کانفرنسوں میں شرکت فرما چکے ہیں۔ تیس سال سے شامِ ہمدرد کا سلسلہ ملک کے ہر شہر میں جاری ہے۔ امریکہ' کینیڈا' برطانیہ' فرانس' روس' چین' جاپان' ناروے' سویڈن' ڈنمارک' جنوبی امریکہ' کوریا' انڈیا---- غرض پورے کرۂ ارض کے ممالک کا دورہ کر چکے ہیں اور خالی دورہ کر کے واپس نہیں آئے بلکہ سفرناموں کی صورت میں کتابیں لکھی ہیں اور اپنے مشاہدات و تجربات کو نسلوں کے حوالے کیا ہے۔ طب کے بارے میں بعض با اثر لوگوں کی غلط فہمیاں دور کرنے کے سلسلے میں انہوں نے بڑا کام کیا ہے۔ نیتجتاً اطبا اور ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کا اتحاد قائم ہو چکا ہے اور اب طب کو شجرِ ممنوعہ قرار دینے والے ختم ہو چکے ہیں

محترم حکیم محمد سعید صاحب نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف قوم اور حکمرانوں کو متوجہ کر کے اس صدی کی ایک شدید ضرورت کو پورا کیا ہے۔ بچوں کے ساتھ ان کی محبت کا یہ عالم ہے کہ ''ہمدرد نونہال'' کے ایک دو اجتماعوں میں شرکت کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ حکیم صاحب قبلہ بچوں کے محبوب ہیں۔ اب انہوں نے شاعری کی قوتِ خیر کے اعتراف کے طور پر ہر شہر میں ہر ماہ ملک بھر کے شعراء کو تحسین کے پھولوں سے لادنا شروع کر رکھا ہے۔ آوازِ اخلاق کی تحریک کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ ہے کہ ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے رہنے

والے اسلامی اخلاق سے بھی دستبردار ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور محترم حکیم صاحب نے ہمارے زوال کا اندازہ لگا کر یہ تحریک شروع کر رکھی ہے۔

غرض محترم حکیم محمد سعید صاحب کی سرگرمیوں کے کس کس شعبے کا ذکر کیا جائے کہ بھی شعبوں کے تذکرے کے بعد بھی اتنے ہی شعبے بچ رہتے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ ان کے یہ کمالات غیر زمینی اور غیر انسانی لگتے ہیں جبکہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے اسی زمین پر بسنے والے انسانوں ہی کی حق رسی کے لیے کیا ہے۔ البتہ میں یہ کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ''سپر ہیومن'' صفات سے نواز رکھا ہے اور انہوں نے ہماری ۴۷ برس کی سیاہ اندھیری تاریخ میں خدمتِ خلق کا ایک ایسا آفتاب روشن کر رکھا ہے جو غروب ہونا جانتا ہی نہیں۔

آخر میں مجھے ایک ایسی بات کہنی ہے جس سے محترم حکیم صاحب کو بھی مجھ سے شکایت ہو سکتی ہے مگر میں ان سے معذرت کے ساتھ کہوں گا ضرور۔ عرض یہ ہے کہ اتنی حیرت ناک خدمات کے باوجود ہماری حکومت کی طرف سے محترم حکیم صاحب کو ابھی تک صرف ستارۂ امتیاز کا اعزاز ملا ہے اور یہ اعزاز ایسا ہے جو مجھ جیسے شعر ساز اور افسانہ نگار کو بھی مل چکا ہے۔ تو ہم سب کو شرم آنی چاہیے کہ حکیم صاحب تو پاکستان کے سب سے بڑے اعزاز کے مستحق ہیں، مگر واضح رہے کہ یہ اعزاز محترم حکیم صاحب کی شخصیت میں کوئی اضافہ نہیں کرے گا بلکہ خود اس اعزاز کا اعزاز بڑھے گا۔[۱]

(یہ تحریر حکیم محمد سعید صاحب کی موجودگی میں، لاہور میں برپا ہونے والی ایک تقریب میں پڑھی گئی)۔

۱- حکیم صاحب کی شہادت کے بعد انہیں پاکستان کا سب سے بڑا سول ایوارڈ۔ ''نشان پاکستان'' ----- دیا گیا۔

٭٭٭

خدیجہ مستور

خدیجہ کی شخصیت پر جو مضمون ہاجرہ نے لکھا، اسے خدیجہ کی شخصیت کے بارے میں حرفِ آخر یقیناً نہیں کہا جا سکتا۔ خدیجہ کے حوالے سے کوئی اور ادیب تو اس پائے کی شخصیت نگاری شاید ہی کر سکے، لیکن ایک شخصیت یقیناً ایسی ہے جو خدیجہ کی شخصیت پر ہاجرہ سے بھی بہتر لکھ سکتی تھی اور وہ خود خدیجہ تھیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر خدیجہ نے کبھی اپنی سوانح عمری لکھی ہوتی تو وہ اُردو کے سوانحی ادب کے معیاروں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی۔ دراصل خود نوشت سوانح کا اولین اور بنیادی مطالبہ سچ بولنا ہے اور خدیجہ دوسروں کے علاوہ خود اپنے بارے میں بھی اتنی بے خوفی سے بے ساختگی سے سچ بولنے کی عادی تھیں کہ میں بڑے اعتماد کے ساتھ اس قسم کی پیش گوئی کر سکتا تھا۔ اس پیش گوئی کا ایک خودغرضانہ مقصد یہ واضح کرنا بھی ہے کہ میری یہ تحریر خدیجہ کا ''کیریکٹر اسکیچ'' نہیں ہے کیونکہ ہاجرہ کے لکھے ہوئے پارۂ تشخص کے بعد میں اس قسم کی جسارت کر ہی نہیں سکتا۔

خدیجہ کے فن پر حضرت فیض احمد فیض، سید احتشام حسین اور ڈاکٹر احسن فاروقی وغیرہ کے سے ماہرینِ نقد لکھ چکے ہیں اور مجھے تنقید نگاری کا قطعی کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ میں نے مسائلِ ادب پر جو اِکا دُکا مضامین لکھے ہیں، وہ تنقیدی سے

زیادہ تاثراتی ہیں، اور یہ تاثرات ایک تخلیقی فن کار کے ہیں، تنقید نگار کے نہیں ہیں۔ چنانچہ میری اس تحریر کو ایک باقاعدہ تنقیدی مضمون بھی نہ سمجھا جائے۔

میں خدیجہ کی شخصیت سے بھی واقف ہوں اور ان کے فن کا بھی بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے میں نے کوشش کی ہے کہ خدیجہ کی شخصیت اور فن کے بعض نمایاں رشتوں کی نشان دہی کروں۔ یہ نشان دہی میری نظر میں، اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ہمارے ہاں فن کار کے فن اور اس کی شخصیت کو الگ الگ خانوں میں رکھ کر جائزہ لینے کا چلن عام ہے۔ اگر کسی فن کار کی شخصیت اس کے فنی موضوعات و نظریات کی نفی کرتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں قباحت ہی قباحت ہے۔ مثلاً اگر کوئی فن کار اپنے فن میں سرمایہ داری اور بڑی زمینداری کو (جسے غلطی سے جاگیرداری کے محدود مفہوم والا نام دے دیا جاتا ہے) انسان کی مادی اور روحانی ترقی کی راہ میں خوفناک رکاوٹ قرار دیتا ہے، مگر عملاً وہ ان اداروں کا محافظ ہے، تو میں اسے فن کار کی ریاکاری قرار دوں گا۔ اگر ایک شاعر محنت کی عظمت اور وقار کے گیت گاتا ہے مگر خود ایک تنکے تک کو توڑنے کی مصیبت سے گھبراتا ہے تو وہ خلوص کے فقدان کا شکار ہے۔ فن، فن کار کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ شخصیت کسی دور افتادہ پہاڑ کی گپھا میں صورت پذیر نہیں ہوتی بلکہ اس خاندان، اس طبقے، اس معاشرے، اس قوم اور اس دور کے ان اثرات کا مجموعہ ہوتی ہے جو ہر انسان پر پڑتے ہیں، مگر فن کار پر زیادہ شدت سے پڑتے ہیں کیونکہ وہ عام انسانوں سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ یوں فن کار کے فن اور شخصیت کے رشتے بہت گہرے ہوتے ہیں اور آپس میں اتنے اُلجھے ہوئے، اتنے گتھے ہوئے ہوتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا چاہو تو اس کے فن کے چہرے پر بھی خراشیں پڑ جاتی ہیں اور اس کی شخصیت بھی زخمی ہو جاتی ہے۔ شخصیت اور فن کے یہی رشتے کسی فن کار کا اسلوب

اور انفرادیت متعین کرتے ہیں' بصورتِ دیگر جب فن کے اصول و قواعد اور اس کے مطالبات و مقتضیات یکساں ہیں تو غالب اور مومن کو' جوش اور حفیظ کو' فیض اور راشد کو ایک ہی رنگ' ایک ہی قسم' ایک ہی نقطۂ نظر کا شاعر ہونا چاہیے تھا۔

خدیجہ اور ہاجرہ بہنیں ہیں۔ خدیجہ بڑی اور ہاجرہ چھوٹی مگر صرف ایک سال چھوٹی۔ دونوں کی پرورش اور تربیت ایک ہی گھر میں' ایک ہی ماحول میں ہوئی۔ دونوں نے اکٹھا افسانے لکھنے شروع کیے۔ یہ افسانے ایک سے رسالوں میں چھپے۔ دونوں اکٹھا ہجرت کر کے لکھنؤ سے لاہور آئیں۔ دونوں کی ایک ہی دن شادی ہوئی' دونوں کے شوہر ملک کے معروف اخبار نویس تھے۔ دونوں کے دو دو بچے تھے اور دونوں کے افسانوں کے چار چار مجموعے تھے۔ ہاجرہ نے اپنے ڈراموں کا مجموعہ ''وہ لوگ'' شائع کرایا تو خدیجہ نے ناول ''آنگن'' لکھ ڈالا۔ یوں دونوں کی تصانیف کی تعداد پانچ پانچ ہی ہے۔ دونوں کے ادبی نظریات ایک تھے۔ اس کے باوجود دونوں کے فن میں' دونوں کے مشاہدے میں' کرداروں کے انتخاب میں' پلاٹ کی تعمیر میں' حد یہ کہ زبان و بیان تک میں اتنا واضح فرق کیوں ہے؟ یہ دونوں کی شخصیتوں کا فرق ہے۔ ویسے تو عام نقادوں نے جب بھی خدیجہ اور ہاجرہ کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا' دونوں کو محض اس قصور کی پاداش میں ''بریکٹ'' کر دیا کہ دونوں سگی بہنیں ہیں' اس لیے ایک کے فن کے جائزے میں دوسری کو بھی شریک کرنا ضروری ہے۔ یہ ادب کو بغور نہ پڑھنے اور آرام کرسی پر لیٹ کر تنقیدیں لکھنے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں بہنوں کے اسلوب میں معمولی فرق بھی نہیں' وہ فرق ہے جسے زمین و آسمان کا فرق کہتے ہیں۔ مگر یہ مقام اس فرق کو اجاگر کرنے کا نہیں ہے۔

خدیجہ کے مزاج کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ تھی کہ وہ لاہور کے جس محلے میں بھی رہیں' ان کے تعلقات ان عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ انتہائی

دوستانہ رہے جنہیں خدیجہ ہی کے خاندان کے بعض بزرگ نفرت سے ''چوہڑوں چماروں'' کی عورتیں قرار دیتے تھے۔ خدیجہ پہلے نسبت روڈ پر رہیں' پھر جیل روڈ پر اور اس کے بعد کینال پارک میں۔ آخر میں وہ گلبرگ میں مقیم رہیں مگر ان کی دوستی اپنی قیام گاہ کے آس پاس کوارٹروں' جھونپڑوں اور چھپروں میں رہنے والیوں سے تھی۔ اعلیٰ طبقے کی بیگمات سے انہیں نفرت تو قطعی نہیں تھی کیونکہ انہیں کسی سے بھی نفرت نہیں تھی اور اگر ہوتی بھی تو بالکل عارضی ہوتی مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان سے دوستی نہیں رکھ سکتی تھیں۔ دراصل ان کی دوستی ہر شخصیت کے اندر کے انسان سے ہوتی تھی مگر بیشتر بیگمات جسمانی اور روحانی طور پر اس مبالغے کی حد تک لپی اور تھپی ہوئی ہوتی ہیں کہ خدیجہ سے ان کا ٹھیک سے تعارف ہی نہیں ہو پاتا تھا البتہ خدیجہ کا مشاہدہ اپنا کام جاری رکھتا تھا۔ انہیں اس امر کا احساس ہی نہیں ہو پاتا تھا کہ یہ جو خدیجہ خلا میں نظریں گاڑے ان کی باتوں پر ہوں ہاں کیے جا رہی ہیں' تو دراصل خدیجہ نے ان کی روحوں کو آپریشن ٹیبل پر لٹا رکھا ہے' اور ان کے مشاہدے کے ہاتھوں میں نشتر ہیں۔ خدیجہ کے ہاں بیگمات کا مصرف بس یہیں تک ہے چنانچہ ان کی اصل دوستی یا تو اپنے طبقے کی اِکا دُکا خوش قسمت خواتین سے ہوتی تھی یا ان مزدوروں اور محنت کشوں کی ماؤں' بیویوں اور بیٹیوں سے جو قطعی غیر شعوری طور پر ان کے فن کے لیے خام مواد مہیا کرتی رہتی تھیں۔

میں حیران ہوتا ہوں کہ خدیجہ' جو ذہنی طور پر اکثر اس مقام سے غائب رہتی تھیں جہاں وہ جسمانی طور پر بیٹھی ہوتی تھیں' ان غریب عورتوں کی توجہ اور محبت کا مرکز کیوں تھیں۔ برسوں کے تجربے کے بعد میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ جب میں ان کی موجودگی میں انھی کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوتا تھا تو وہ میری باتیں نہیں سن رہی ہوتی تھیں بلکہ کہیں دور پہنچی ہوئی ہوتی تھیں۔ پھر انہوں

نے اپنے مشہور افسانے ''ہینڈ پمپ'' کی چنی بیگم کا اتنا گہرا اور ہمہ گیر مطالعہ کیسے کر لیا اور انہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ جب گٹھیا کی وجہ سے چنی بیگم کے گھٹنے سوج جاتے تھے تو چمکنے لگتے تھے۔ خدیجہ جو عموماً ''غائب'' رہتی تھیں، ان لوگوں کے سلسلے میں اتنی شدت سے ''حاضر'' کیوں تھیں ! اس کا راز ان کی شخصیت کے اس پہلو میں مل سکتا ہے کہ وہ اخبار بھی پڑھتی تھیں تو رو دیتی تھیں۔ کراچی میں ایک بچہ رکشے کے نیچے آ کر مر گیا اور خدیجہ بیٹھی دھاروں دھار رو رہی ہیں۔ راولپنڈی میں ایک جوان لڑکی نے شادی کے تیسرے دن بعد گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی اور خدیجہ کے آنسو روکے نہیں رکتے۔ لاہور میں ایک مریض نے میو ہسپتال کے باہر فٹ پاتھ پر دم توڑ دیا اور آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے والی خدیجہ کا جی چاہ رہا ہے کہ وہ اس کے جنازے میں شریک ہوں۔ بے بسی اور محرومی سے ان کی یہ ہمدردی اس لیے نہیں تھی کہ بڑے لوگوں کی طرح انہیں ان بے بسوں اور محروموں پر ترس آتا تھا۔ ترس کھانا تو اس سرمایہ دارانہ معاشرے کا ایک فیشن ہے جس کو بدلنا خدیجہ کی عزیز ترین آرزو تھی۔ دراصل خدیجہ ان کرداروں سے اپنائیت محسوس کرتی تھیں۔ انسانی اپنائیت! وہ سوچتی تھیں کہ یہی انسان اگر بہتر معاشرے کے خوشگوار ماحول میں ہوتے تو ممکن ہے، وہ ملک و قوم اور انسانیت کے لیے ہم سب سے بہتر ثابت ہوتے۔ پھر خدیجہ کی یہ اپنائیت کھوکھلی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے گھر کی لگی بندھی آمدنی میں سے ہر ممکن بچت کو ان بے بسوں اور محروموں پر چپکے سے یوں صرف کرتی رہتی تھیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ اور وہ یہ سب کچھ یوں نہیں دیتی تھیں جیسے بھیک دے رہی ہوں۔ یوں دیتی تھیں جیسے ایک ایسی سہیلی کا فرض ادا کر رہی ہوں جس کی اتفاق سے---محض اتفاق سے---اتنی آمدنی ہے کہ وہ کسی کی محتاج نہیں ہے، اور بس۔

خدیجہ کی شخصیت کی اسی خصوصیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ مجال ہے جو

وہ اپنے گھر کے کسی ملازم کو دھتکارتیں۔ ایسی متعدد مثالیں ہیں کہ کشمیر یا مری کی طرف سے پانچ پانچ سات سات سال کے غریب بچے لاہور میں روزگار ڈھونڈنے آئے اور خدیجہ کے پاس پہنچے تو چند ہی دنوں کے اندر ان کے چہرے سرخ ہوگئے اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ پھر ان کی تربیت ہونے لگی۔ انہیں تعلیم دی جانے لگی۔ انہیں آداب اور قسم قسم کے کھانے پکانے کے طریقے سکھائے جانے لگے، اور جب وہ جوان ہوئے تو خدیجہ نے اپنے شوہر ظہیر بابر کی مدد سے انہیں کہیں اچھا سا روزگار دلا دیا۔ میں گذشتہ سالہا سال سے دیکھ رہا ہوں کہ یہ ملازم خدیجہ کے گھر سے جا کر بھی اس گھر کے خادم رہے۔ مجھے ایک بھی ایسی مثال یاد نہیں ہے جب خدیجہ نے کسی ملازم کو خفا ہو کر جواب دے دیا ہو۔ خفا وہ ضرور ہوتی تھیں مگر ملازم کو معلوم ہوتا تھا کہ بیگم صاحبہ ابھی چار پانچ منٹ کے اندر اس خفگی کی تلافی کے لیے تشریف لے آئیں گی۔

خدیجہ کے مزاج کی اسی خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں کرداروں کا تنوع حیران کن ہے۔ چھیڑنے کو تو میں انہیں اکثر کہتا رہتا تھا کہ آپ چولھے ہنڈیا سے ہٹ کر کیا خاک افسانے لکھیں گی، مگر سچی بات یہ ہے کہ جو رنگا رنگی اور گونا گونی خدیجہ کے افسانوں کے کرداروں اور موضوعات میں ہے وہ کم سے کم اُردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں تو مشکل ہی سے ملے گی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ خدیجہ کو اپنی کہانیوں کے کردار گھڑنے نہیں پڑتے تھے۔ یہ جیتی جاگتی صورت میں ہر وقت ان کے آس پاس موجود رہتے تھے۔ ان کے یہ کردار ''دادا'' اور ''دس نمبری'' سے لے کر ''بورکا'' اور ''دلعنتی'' تک پھیلے ہوئے ہیں۔

خدیجہ کے ہاں افسانوں کے موضوعات اور کرداروں کے اتنے ڈھیر لگے تھے کہ افسانہ لکھنے کی خاطر ان کے لیے صرف یہ کام باقی رہ جاتا تھا کہ وہ قلم اٹھائیں اور لکھنا شروع کر دیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اگرچہ وہ لکھنؤ کی رہنے والی

تھیں، زبان پر انہیں بے پناہ عبور حاصل تھا مگر ان کا کوئی ایک بھی ایسا افسانہ پیش نہیں کیا جا سکتا جس سے ظاہر ہو کہ وہ اپنی زبان دانی پر اترا رہی ہیں۔ ان کے ہاں نہ محاورے بازی ہے، اور نہ فقرے بازی ہے۔ وہ جس طرح اپنی زندگی میں غیرضروری آرائش و زیبائش کی عادی نہیں تھیں، اسی طرح اپنے فن کو بھی سلمے ستارے، رنگ رنگ کے فیتوں اور قسم قسم کی گھنگھریوں سے آراستہ نہیں کرتی تھیں۔ عام زندگی میں ان کی سادگی اور انسانی رشتوں کے معاملے میں ان کی سادہ دلی ان کے ادب میں یوں نمایاں ہوتی ہے کہ وہ انسانی نفسیات کے بے حد گہرے مسائل کو نہایت آسان اور بے انتہا سلیس جملوں میں بیان کرتی چلی جاتی تھیں۔ ان کا اندازِ تحریر ایک ایسی نرم رو ندی کا تھا جس کا کام شور مچانا نہیں ہے، صرف بہنا اور شاداب کرنا ہے۔ یہ ندی جب مسائل کے پہاڑوں میں سے بھی گزرتی تو کوئی ہنگامہ برپا نہیں کرتی تھی، پتھروں سے اُلجھ کر بس ذرا سا گنگنا لیتی تھی۔ دراصل خدیجہ کو اس بات کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ وہ زبان کے چٹخارے کی مدد سے اپنی کہانیوں کو سرخی پاؤڈر لگاتی پھریں۔ یہ زبان کا چٹخارہ کوئی معمولی ترغیب نہیں ہے۔ عصمت چغتائی کی سی اعلیٰ پائے کی افسانہ نگار بھی اس کمزوری سے نہیں بچ سکیں اور اپنے بیشتر افسانوں میں زبان دانی کا مظاہر کرتی نظر آتی ہیں مگر خدیجہ کو بننے کا کوئی شوق ہی نہیں تھا۔ نمائش سے وہ کتراتی تھیں، ہیر پھیر سے انہیں نفرت تھی۔ عام زندگی کی طرح افسانوں میں بھی وہ دوٹوک بات کرنے کی عادی تھیں۔ ان کے ناول ''آنگن'' پر لکھتے ہوئے بعض اصحاب نے کہا تھا کہ اس ناول کے چند حصے ایسے ہیں کہ اگر خدیجہ چاہتیں تو ان پر محنت کر کے انہیں ادبی لحاظ سے بہتر بنا سکتی تھیں۔ دراصل ہمارے ادب کا قاری سادگی اور سلاست کا عادی نہیں ہے۔ اسے عربی، فارسی کے موٹے موٹے الفاظ و تراکیب کا اتنا نشہ ہو چکا ہے اور ادب میں جھالروں اور پھندنوں سے اسے اس قدر مانوس بنا ڈالا

گیا ہے کو وہ سلاست اور سادگی کو ادب کے منافی قرار دینے لگا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ ایک سادہ جملہ لکھنا ایک گرجتے گونجتے پھنکارتے اور دھاڑتے ہوئے جملے کے مقابلے میں کتنا مشکل ہے۔ شاید اسی لیے مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے دوستوں کی اس شکایت کے جواب میں کہ وہ اپنے اخبار میں اتنے لمبے لمبے اداریے کیوں لکھتے ہیں' فرمایا تھا کہ عزیزو! مختصر اداریے لکھنے کا میرے پاس وقت نہیں ہوتا! میرا خیال ہے کہ اپنے افسانوں اور ناول میں جتنے مختصر جملے خدیجہ نے لکھے اتنے گذشتہ پچاس برس کے اُردو افسانہ نگاروں میں شاید ہی کسی نے لکھے ہوں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خدیجہ اپنے افسانوں کو غیرضروری محاوروں اور ترکیبوں سے شعوری طور پر پاک رکھتی تھیں۔ میرے اس اندازے کا پس منظر یہ ہے کہ خدیجہ میں مزاح اور طنز کی حس غیرمعمولی حد تک تیز تھی۔ وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں پر اکثر اوقات ایسے ایسے فقرے چست کر جاتی تھیں کہ مخاطب کو بغلیں جھانکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا تھا۔ ان کی یہ حس اتنی شدت کی حد تک تیز تھی کہ بعض ایسے لوگ بھی ان کی تیز دھار زبان کی کاٹ سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے جن کے ساتھ بے تکلفی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ خدیجہ نے اپنے عزیزوں اور سہیلیوں کو جو خطوط لکھے ہیں وہ اگر یکجا کر کے چھاپ دیے جائیں تو ایک ایسی خدیجہ سامنے آئیں گی جن کا ہنسنے ہنسانے کے سوا جیسے اور کوئی کام ہی نہیں۔ اتنے شگفتہ خطوط میری رائے میں غالب کے بعد خدیجہ ہی نے لکھے ہیں۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے لیکن اگر یہ خطوط چھپ گئے تو آپ کو میرے اس دعوے کا ثبوت مل جائے گا۔ مگر جب یہی خدیجہ افسانہ لکھنے بیٹھتی تھیں تو اپنی تمام حیثیتوں کو بھول کر صرف افسانہ نگار بن جاتی تھیں۔ یہ بڑا مشکل کام ہے اور یہ کمال بڑی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ افسانہ نگار خدیجہ فقرے

باز نہیں تھیں۔ اگر ان کے ذہن میں کوئی نہایت خوبصورت اور تیکھا فقرہ آیا مگر وہ ان کے افسانے کی فضا سے مطابقت نہیں رکھتا تھا تو وہ اسے کمال سیر چشمی سے رد کر دیتی تھیں۔ مجھے یہ اندازہ اس لیے ہے کہ گفتگو کی حد تک خدیجہ کا سا فقرے باز انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ظاہر ہے کہ افسانہ لکھتے ہوئے اس قسم کے کتنے ہی فقرے ان کے ذہن میں آتے ہوں گے مگر کسی بھی فقرے کا حسن انہیں افسانے کے مجموعی تاثر کو گزند پہنچانے کا لالچ نہیں دے سکتا تھا۔ یہ خدیجہ کا ایثار تھا اور ایثار کی یہ عادت بہت کم افسانہ نگاروں کو ہوتی ہے۔

خدیجہ جس بے ساختگی سے روتی تھیں، اسی بے ساختگی سے ہنستی بھی تھیں مگر مجال ہے جو وہ اپنے افسانوں کے کرداروں پر ہنسیں۔ یقیناً ہمارے معاشرے میں ایسے کردار بھی ہیں جن کی مذمت کرنے کی بجائے ان پر ذرا سا ہنس کر ہی ان کی شخصیتوں پر سے ملمع اتارا جا سکتا ہے، مگر خدیجہ کے افسانوں کے مرکزی کردار عموماً ایسے ہوتے ہیں جن پر ہمارا مصنوعی معاشرہ ہنستا ہے اور خدیجہ کا اس کھوکھلے معاشرے کے قہقہوں کا ساتھ دینا خارج از بحث تھا۔ وہ ان کرداروں کی ماں، بہن اور بیٹی بن کر افسانے لکھتی تھیں اور مائیں اپنی اولاد پر، اور بہنیں اپنے بھائیوں پر اور بیٹیاں اپنے والدین پر ہنسا نہیں کرتیں۔ وہ تو ان کی خوشی پر خوش ہوتی ہیں مگر یہ خوشیاں اس طبقے میں نہایت محدود، نہایت کمیاب ہیں جن میں سے خدیجہ اپنے افسانوں کے کردار منتخب کرتی تھیں، اس لیے خدیجہ ان پر صرف کڑھ سکتی تھیں اور وہ جب کڑھتی تھیں تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے کرداروں کے دکھ میں شرکت کرتی ہیں۔ انہیں اپنے کرداروں کے معاشرتی رشتوں کا بہت اچھی طرح علم ہوتا تھا چنانچہ ان کے ہر افسانے کا ہر کردار ہمیشہ اپنے معاشرے کے پس منظر میں نمایاں ہوتا ہے۔ خدیجہ ان کرداروں کی ہر مصیبت، ہر پریشانی کے سائنٹیفک تجزیے سے لیس ہوتی تھیں اور کڑھتی اس بات پر تھیں کہ جو معاشی

ناآسودگی ان کرداروں کے تمام دکھوں کا منبع ہے' وہ اس معاشرے سے کب ختم ہوگی اور جو طبقاتی تربیت ان کرداروں کو ملتی ہے اور ایک خاص قسم کی ذہنیت مرتب ہو جاتی ہے' اس کا سلسلہ کب ٹوٹے گا۔

اپنے افسانے کے معاملے میں خدیجہ اتنی چاق و چوبند تھیں کہ وہ جو اس بات پر بھی زار زار رو سکتی تھیں کہ ہائے' میں نے کتنی مدت سے کوئی افسانہ نہیں لکھا' اپنے افسانوں میں روتی رُلاتی دکھائی نہیں دیتیں۔ ایک بار وہ کسی ایسی ہی ننھی منی بات پر رو رہی تھیں تو میں نے ان سے کہا تھا کہ آپ اتنے موٹے موٹے آنسوؤں کا بندوبست کہاں سے کر لیتی ہیں۔ آپ کے آنسوؤں کی جسامت تو انگور کے دانوں کی سی ہے۔ اس پر وہ بے اختیار ہنسنے لگی تھیں۔ روتے میں کھل کر ہنسنے لگنا ان کی ایک دلچسپ عادت تھی مگر اپنے افسانوں میں وہ روتی نہیں تھیں اس لیے ہنستی بھی نہیں تھیں۔ البتہ مجھے ایک بات کا شبہ ہے۔ میں ''موقع کا چشم دید گواہ'' نہیں ہوں اس لیے اپنے اس اندازے کو شبہ کہہ رہا ہوں ورنہ مجھے یقین ہے کہ جب وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کے بارے میں سوچنے یا افسانہ لکھنے بیٹھتی ہوں گی تو آنکھوں سے ان ''انگوروں'' کے ڈھیر لگا دیتی ہوں گی۔ مثلاً میں مان نہیں سکتا کہ انہوں نے ''ہینڈ پمپ'' کی چنی بیگم کے گرد جب افسانے کا تانا بانا بنا ہوگا تو ان کی آنکھیں نم نہ ہوئی ہوں گی۔ میرا یہ شبہ اس لیے بھی درست ہے کہ وہ اپنے اندر کا ابال پہلے ہی سے نکال دیتی ہیں' اس لیے ان کے افسانے اس رِقت سے کلیتہً محفوظ رہتے ہیں جو جذبات زدگی کی پیداوار ہوتے ہے اور جو افسانہ نگار کو Detach (عدم وابستہ) نہیں رہنے دیتی۔

فیض احمد فیض نے خدیجہ کے افسانوں کے ایک مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ یادگار فقرہ لکھا تھا کہ خدیجہ---- ''مصوری کم کرتی ہیں اور کشیدہ کاری زیادہ''---- خدیجہ کو یقیناً کشیدہ کاری یعنی جزئیات نگاری کا کمال

حاصل تھا، مگر میرے خیال میں وہ محض کشیدہ کاری نہیں کرتی تھیں۔ وہ مصور بھی تھیں مگر ان کی مصوری عبدالرحمٰن چغتائی اور استاد اللہ بخش کی مصوری سے مختلف تھی۔ یوں سمجھیے کہ وہ زین العابدین کی سی مصور تھیں کہ ان کے موقلم کی ایک جنبش---- ایک اسٹروک درجنوں رنگوں اور بیسیوں آرائشوں سے زیادہ بلیغ معلوم ہونے لگتی تھیں اور یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ خدیجہ کو زندگی اور فن میں غیرضروری آرائش و زیبائش سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ انہیں صرف سلیقے سے پیار تھا اور سلیقے سے لگا ہوا ایک خط اپنی زبانِ بے زبانی سے جب بولتا ہے تو اس کی آواز کائنات کے دور دراز گوشوں تک پہنچتی ہے۔

میں خدیجہ کے سادہ سلیس مگر گہرے اور پُرکار ناول ''آنگن'' کو بھی ان کے مُوقلم کی ایک ایسی ہی بلیغ اسٹروک سمجھتا ہوں۔ ''آنگن'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدیجہ کو تاریخ اور سیاست پر حیران کن عبور حاصل تھا۔ انہیں تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان کے نازک سے نازک نشیب و فراز کا کماحقہٗ علم تھا مگر اپنے ناول میں انہوں نے یہ علم اُگلا نہیں ہے، اسے کینوس کے طور پر استعمال کیا ہے۔ افسانوں کی طرح اس ناول میں بھی انہوں نے کہیں علمیت نہیں گانٹھی، کہیں تقریر نہیں کی، کہیں اقتباسات کے انبار جمع نہیں کیے، کہیں اپنے قاری پر یہ کہہ کر مسلط نہیں ہوئیں کہ ہمیں داد دو، ہم نے اپنی تاریخ اور سیاست اور ادب میں سے کیا کچھ پڑھ رکھا ہے---- اس کے باوجود خدیجہ کے برش کی ایک استادانہ اسٹروک نے اُردو ناول نگاری کے سناٹوں کو گونجا دیا۔ دراصل خدیجہ کو کتابیں پڑھنے سے زیادہ زندگی پڑھنے پر فخر تھا۔ کتابیں انہوں نے بے شمار پڑھی تھیں مگر زندگی کو اس سے زیادہ پڑھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ادب میں علمیت پر فن کو ترجیح حاصل ہے۔

یہ تھیں خدیجہ جن کی زندگی میں جو سادگی، پیار او اپنائیت تھی، وہی ان کے

فن میں بھی تھی، اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، ان کی شخصیت کی ایک خصوصیت ایسی تھی جسے اپنے فن میں منتقل ہونے سے انہوں نے شاید شعوری طور پر روک رکھا تھا اور وہ ان کی پھبتی تھی، طنز سے بھرا ہوا ان کا کٹیلا فقرہ تھا' اور ساتھ ہی ان کے غیر مختتم قہقہے تھے۔ میں نے ایک محفل میں ان کی شخصیت پر ایک مضمون پڑھا۔ خدیجہ اس محفل میں موجود تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ جب یہ محفل ختم ہوگی تو خدیجہ میری اس تحریر کے بعض حصوں کی ''بقراطیت'' پر قیامت کے فقرے کسیں گی اور اگر میں نے ان فقروں سے بھی زیادہ نوکیلے اور چوٹیلے فقروں سے جواب دینے کی کوشش کی تو وہ سرے سے سنیں گی ہی نہیں کیونکہ وہ فقرہ کسنے کے بعد ہنستی تھیں تو ہنستی ہی چلی جاتی تھیں اور مقابل چاہے گلا پھاڑ پھاڑ کر بھی جواب دے تو وہ سنتی ہی نہیں تھیں کیونکہ وہ ہنسنے میں مصروف ہوتی تھیں---- اور جب ہنس چکتی تھیں تو آنسو پونچھنے بیٹھ جاتی تھیں۔

ابنِ انشا

ابنِ انشا کی نظم و نثر کے حسن پر گفتگو کرتے ہوئے نقاد ہی بھلے لگتے ہیں۔ میرے پیشِ نظر تو انشا کی بعض یادوں کی بازیافت ہے۔ رخصت ہو جانے والے دوستوں کی یادیں ہی تو محبت و رفاقت کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ ان یادوں کی بازیافت' اس ہمیشہ کے لیے چھن جانے والے دوست کو عارضی طور پر زندہ کر لینے کی ایک کوشش ہے۔ انشا کی یادیں تو بے شمار ہیں مگر میں آج آپ کو اپنی اُن یادوں میں شریک کرنا چاہتا ہوں جن میں انشا کا وجود مجسم تبسم بن کر سامنے آتا ہے۔ انشا کی متبسم شخصیت کی یاد اس کی جدائی کے زخموں کو اور گہرا کر جاتی ہے اور ہم جو اس کی باتوں پر مسکراتے ہیں' اندر ہی اندر روتے ہیں کہ یہ گوہرِ گراں مایہ ہم سے اتنی جلدی کیوں چھن گیا اور یہ نعمت ہم سے ایک دم کیوں واپس لے لی گئی۔

انشا سے میری شناسائی اس وقت سے تھی جب وہ شیر محمد قیصر تھا۔ خط و کتابت میں ہماری بات چیت بیشتر شاعری کے بارے میں ہوتی تھی اس لیے مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ شیر محمد قیصر کے پردے میں ایک خوب صورت شاعر کے علاوہ ایک بے مثل مزاح نویس' ایک زندہ دل سفرنامہ نگار' ایک محتاط مترجم' بچوں کا

ایک محبوب شاعر، ایک وضع دار دوست اور ایک بے لوث انسان بول رہا ہے۔
جب وہ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے لاہور آیا تو میں پشاور ریڈیو سے متعلق تھا۔ پھر جب میں لاہور منتقل ہوگیا تو انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار اجتماعوں میں اس کا قریبی ساتھ رہا۔ انہی دنوں ابراہیم جلیس حیدر آباد سے لاہور آیا اور مجھ سے ملا تو اس نے اِنشا کے ہاں جانے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میں ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے سامنے اسے اِنشا کے گھر لے گیا۔ یہ چھوٹا سا گھر چینی طرزِ تعمیر کا تھا۔ ویسے بھی اِنشا کے نقوش کچھ چینی سے تھے۔ چنانچہ جب اِنشا گھر سے باہر آیا تو ابراہیم جلیس نے اسے سینے سے لپٹاتے ہوئے کہا ''مہاتما بدھ! تم تو پگوڈا میں رہنے لگے۔'' اور اِنشا بولا ''اے ازلی بھکشو! اس پگوڈا کے دروازے تمہارے لیے ایک بھائی کی باہوں کی طرح کھلے ہیں۔''

اِنشا سے میری ملاقاتیں بیشتر پرتکلف ماحول میں ہوتی تھیں اس لیے مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ بظاہر اس اُداس چہرے کے پیچھے شگفتگی اور زندہ دلی کا ایک سمندر متلاطم ہے۔ اس کی شخصیت کا یہ دلآویز پہلو مجھ پر بتدریج منکشف ہوا جب تکلف کی دیوار گر گئی اور ہمارے درمیان دو ہم سطح اور ہم مرتبہ دوستوں کی طرح تبادلۂ خیال ہونے لگا۔ ان دنوں ہمارا معمول تھا کہ ہم انجمن کے اجلاس کے بعد میکلوڈ روڈ کے چوک لکشمی کے ایک ریسٹورنٹ میں اکٹھا ہوتے، اور چائے پیتے۔ بل ادا کرنے کا وقت آتا تو سب حاضرین اس میں شرکت کرتے مگر ایک روز اِنشا نے بڑے پتے کی ایک تجویز پیش کی۔ اس نے کہا ''یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ بل آتا ہے تو ویٹر کے سامنے ہم ایک ایک آنے کا چندہ جمع کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم ہیں تو فقیر لوگ مگر ریسٹورنٹ کے ویٹروں پر یہ ظاہر کرنا کچھ ایسا ضروری تو نہیں ہے کہ ہم بھی ان کی طرح قلاش ہیں۔ چنانچہ آئندہ ہفتے جب ہم چائے کا آرڈر دیں تو فوراً بعد، سب لوگ چپکے سے، ایک ایک آنہ میرے پاس جمع کرا

دیں۔ جب بل آئے گا تو اسے یک مشت ادا کر دیا جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ اس طرح ویٹر آئندہ ہمارے سامنے ٹوٹی ہوئی پیالیاں لگانے سے احتراز کریں۔'' ---- اس تجویز کو بہت پسند کیا گیا۔ اگلے ہفتے سب نے ایک ایک آنہ انشا کے حوالے کیا مگر جب گنتی ہوئی تو اس میں انشا کا آنہ شامل نہیں تھا۔ کسی نے احتجاج کیا تو وہ بولا: ''اے مزدوروں کو ان کا منصفانہ معاوضہ ادا کرنے کے علم بردارو! میں نے تم سب سے ایک ایک آنہ جمع کرنے میں جو جسمانی محنت اور اس رقم کی گنتی میں جو دماغی ریاضت صرف کی ہے، کیا اس کا معاوضہ ایک آنہ بھی نہیں بنتا؟ چنانچہ اس رقم میں تمہارا ایک ایک آنہ اور میری محنت شاقہ شامل ہے! تم نے ایک ایک آنے کی خریدی ہوئی چائے پی۔ میں نے اپنی محنت کی کمائی کی چائے پی!''

پھر ایک روز انشا میرے پاس آیا۔ کہنے لگا ''آپ پیرزادے ہیں۔ خدا سے دعا کیجیے کہ ماؤزے تنگ کی فوجیں سالنامہ ''ادبِ لطیف'' شائع ہونے تک شنگھائی پر قبضہ نہ کر سکیں۔'' میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا ''سالنامہ ادب لطیف میں شنگھائی کے عنوان سے میری ایک نظم چھپ رہی ہے جس میں شنگھائی کا مقدر بدلنے کے لیے میں نے ماؤ کی فوجیں بلوائی ہیں۔ اگر ان فوجوں نے نظم کی اشاعت سے پہلے ہی شنگھائی پر قبضہ کر لیا تو میری نظم پر زمانۂ ماضی کا قبضہ ہو جائے گا۔ ماؤزے تنگ خود بھی شاعر ہے۔ اسے بھی تو چاہیے کہ شنگھائی پر اتنی طوفانی یلغار کرنے کی بجائے پاکستان میں ایک نظم کی اشاعت کا تھوڑا سا انتظار کر لے۔''

ایک بار ہمارے ایک عزیز دوست کی غزل شائع ہوئی جس کا ایک مصرع یہ تھا ---- ''پھولوں پہ انہماک سے شبنم گرائیں گے۔'' ---- ہفتہ وار چائے نوشی کے دوران کسی نے کہا کہ یہ شبنم گرانا اور پھر انہماک سے شبنم گرانا کیا

ہوا؟'' اِنشا بڑی معصومیت سے بولا ''لو یہ بھی کوئی اُلجھن کی بات ہے۔ یوں سمجھ لو کہ شاعر پھولوں کی ایک کیاری میں بیٹھا ہے۔ اس کے پاس شبنم سے بھرا ہوا ایک کٹورا رکھا ہے۔ ہاتھ میں ڈراپر ہے۔ وہ اپنی عینک کو ناک کے آخری سرے پر رکھ کر ڈراپر کی مدد سے کٹورے میں سے شبنم کا ایک قطرہ اٹھاتا ہے اور پھول پر اس احتیاط سے گراتا ہے کہ کہیں وہ پھول کی پتی پر سے اِدھر اُدھر لڑھک نہ جائے۔ اسے کہتے ہیں پھولوں پر انہماک سے شبنم گرانا!''

ایک اور شاعر دوست نے اِنشا کے مزاج پوچھے تو وہ بولا ''ویسے تو ہر طرح خیریت ہے مگر کل سے کھانسی ہو رہی ہے۔'' شاعر نے کہا ''کوئی بے احتیاطی کی ہوگی۔'' انشا بولا ''ہاں بے احتیاطی ہی ہوئی۔ دراصل میں تمہاری وہ غزل بہ آوازِ بلند پڑھ بیٹھا جو کل ہی شائع ہوئی ہے۔'' شاعر نے پوچھا ''مگر میری غزل کا کھانسی سے کیا تعلق؟'' اِنشا نے جواب دیا ''غزل کے مفہوم کا تو کھانسی سے کوئی تعلق نہیں مگر تمہاری غزل کے قوافی بہت کھانسی آور نکلے'' ---- اور اس کے بعد اِنشا نے شاعر کو اس کے قوافی سنائے اور ہر قافیے کے ساتھ کھانستا چلا گیا ---- ''تفہیم ہے۔ ترحم ہے ---- توہم ہے ---- !''

اسلام آباد میں وزارتِ تعلیمات کے زیرِ انتظام ایک اجلاس ہو رہا تھا۔ ایک صاحب نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ پنجاب میں ایم۔اے۔ اور ایم۔ایس۔سی تک ذریعۂ تعلیم پنجابی ہونا چاہیے۔ اِنشا پنجابی تھا اور اُردو کی طرح پنجابی کا بھی رسیا تھا مگر صاف صاف کہہ دیا کہ ایم۔اے اور ایم۔ایس۔سی کو فی الحال رہنے دیجیے اور میٹریکولیشن یا انٹر تک اکتفا فرمائیے۔ وہ صاحب بولے ''ہم پنجابی زبان کو اتنی ترقی دیں گے کہ اس میں ایم۔اے اور ایم۔ایس۔سی کی بھی تعلیم دی جا سکے گی۔'' اِنشا نے کہا ''یہ تو بڑی خوش آئند بات ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم پنجابی کو پنجابی ہی رہنے دیں اور اس میں جو بھی ترقی ہو، بتدریج

ہو اور پنجابی پنجاب کے مختلف علاقوں کی مخصوص لفظیات اور لہجوں اور محاوروں اور روزمروں اور کہاوتوں کا سرمایہ جمع کرتی ہوئی آگے بڑھے؟ آپ بہت جلدی میں معلوم ہوتے ہیں اس لیے احتیاط رکھئے گا کہ اس عجلت میں پنجابی اتنی زیادہ ترقی نہ کر جائے کہ اُردو بن کر رہ جائے!''

ایک صاحب علامہ اقبال پر کام کر رہے تھے۔ ایک اجلاس میں ان کی گفتگو سننے کے بعد قدرت اللہ شہاب نے انشا سے کہا ''مجھے تو یہ شخص حواس باختہ معلوم ہوتا ہے۔'' انشا نے فوراً شہاب صاحب کی تصحیح کی۔ بولا ''آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ حواس باختہ تو وہ کسی طرف سے نہیں ہے۔ البتہ اقبال باختہ ضرور ہے!''

میری نظم ''انسان عظیم ہے خدایا'' شائع ہوئی تو کراچی کے بعض اہلِ ادب نے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ ابنِ انشا کراچی ہی میں مقیم تھا۔ اس نے معترضین سے اتنے سلیقے کے ساتھ لڑائی لڑی کہ شاید میں بھی اتنی بہت سی جوابی منطق پیش نہ کر سکتا۔

پھر وہ واقعہ تو میں نے فیض صاحب سے متعلق یادوں میں تفصیلاً درج کر دیا ہے کہ فیض صاحب نے میری غیر حاضری میں پاکستان کی طرف سے افریشیائی ادیبوں کے اس ادارے کی رکنیت کے لیے درخواست لکھنا چاہی جس کا ہیڈکوارٹر قاہرہ تھا۔ تب ابنِ انشا نے مودبانہ عرض کیا کہ ''پاکستان تو اس افریشیائی ادیبوں کے ادارے کا بہت پہلے سے رکن ہے جس کا ہیڈکوارٹر کولمبو ہے' اور اس ادارے کی پاکستانی شاخ کے صدر احمد ندیم قاسمی ہیں۔ یہ نئی درخواست لکھنے سے پہلے ان سے مشورہ کر لیجیے کہ کہیں روس اور چین کے افتراق کا بوجھ پاکستانی ادیبوں کے نازک کندھوں پر نہ آ پڑے۔'' بھری محفل میں فیض صاحب کی سی بڑی اور محترم شخصیت کو ٹوک دینا' ابنِ انشا کی حوصلہ مندی اور حقیقت پسندی کا بلیغ

ثبوت ہے۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ میں نے فیض صاحب سے متعلق یادوں میں بیان کر دیا ہے۔

اور یہ اس آخری دعوت کا واقعہ ہے جب اِنشا اپنی بہن کی شادی پر آخری بار لاہور آیا تھا۔ دعوت میں لاہور کی ساری ادبی برادری مدعو تھی۔ اِنشا کو جس نے بھی دیکھا' اس کا جی دھک سے رہ گیا کہ وہ بالکل دھان پان ہو رہا تھا اور اس کا مرض اس کی مسکراہٹوں اور چٹکلوں سے بھی چھپائے نہیں چھپ رہا تھا۔ اس کی شگفتہ طبعی صحت کے اس عالم میں بھی اسی طرح توانا تھی۔ وہ دوستوں کی مدارات کے سلسلے میں یہاں سے وہاں گھوم رہا تھا۔ میں کھانا ختم کر چکا تو وہ کھیر کے دو پیالے اٹھائے میرے پاس آیا اور بولا ''یہ لیجیے آپ تو مٹھاس کے بڑے رسیا ہیں نا۔'' میں نے کہا ''اِنشا جی! میں تو ابھی ابھی کھیر کے دو پیالے صاف کر چکا ہوں۔'' اور اِنشا بولا ''ویسے تو میں کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا کہ ابھی ابھی آپ نے کھیر کے ساتویں اور آٹھویں پیالے کی صفائی کی ہے مگر اس نویں دسویں پیالے کا بھی صفایا کر دیجیے کہ ---- صفائی عجب چیز دنیا میں ہے!''

صحت کے اس مخدوش عالم میں بھی اِنشا کی خوش مزاجی اور حوصلہ مندی کے دو نہایت غیرمبہم ثبوت میں نے ''فنون'' میں درج کیے تھے۔ ایک تو لندن سے آنے والے اس کے ایک خط کا یہ جملہ مجھے نہیں بھولتا کہ ---- فنون میں میری کتاب پر تبصرہ شائع ہونا چاہیے اور اگر شائع ہو چکا ہے تو ایک اور تبصرہ بھی شائع کر دیجیے کہ بڑی کتابوں پر ایک سے زیادہ تبصروں کی اشاعت میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ پھر میرے نام اِنشا کا مفصل آخری خط تھا اور ساتھ ہی اس کی زندگی کا آخری مضمون جس میں اس نے ملک الموت کی پسلیوں میں بھی ٹہوکے دیے تھے۔ یہ تھا روحانی گہما گہمی اور زندہ دلی سے چھلکتا ہوا اِنشا جس کی برسی مناتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود زندگی کی برسی منا رہے ہیں۔

ابنِ انشا ان مرنے والوں میں سے ایک ہے جن سے مل کر، جن سے باتیں کر کے، جن کی دوستی کا اعزاز حاصل کر کے، جن کے اندر ابلتی اور مچلتی ہوئی زندگی کا مشاہدہ کر کے ہم بڑے اعتماد کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ موت ان کے قریب سے بھی گزرتے ہوئے شرمائے گی۔ مرنا تو سبھی کو ہے مگر یہ اتنی جلدی نہیں مریں گے اور زندگی سے ان کا پیار اور زندہ رہنے کے سلسلے میں ان کا عزم انہیں انتہائی سفید براق بڑھاپے تک لے جائے گا۔ مگر پھر یہ لوگ یکایک مر جاتے ہیں اور ہم جنہیں ہمیشہ سے بے ثباتی دنیا کے درس دیے گئے ہیں سوچتے ہیں کہ یہ دنیا محض بے ثبات ہی نہیں ہے، بے حد سفاک بھی ہے کہ جو زندہ رہنے کے لائق ہوتے ہیں انہیں سمیٹ کر اپنے سینے میں اتار لے جانے کی اسے ہمیشہ بڑی جلدی پڑی رہتی ہے اور زندگی کا منظر اجڑ جاتا ہے اور اتنے بہت سے انسانوں کے ہجوم میں ہم تنہا رہ جاتے ہیں۔

ابھی ہم خاصی مدت تک یہ فیصلہ نہیں کر پائیں گے کہ ابنِ انشا بہت پیارا شاعر تھا یا بہت پیارا فکاہیہ نویس تھا یا بہت پیارا سفرنامہ نگار تھا یا بہت پیارا مترجم تھا یا بہت پیارا انسان تھا۔ دراصل ہم لوگ شخصیتوں کو خانوں میں بانٹنے کے عادی ہیں کیونکہ اس طرح اس شخصیت کے محاکے میں اور نتیجتاً اس کی حق تلفی میں سہولت رہتی ہے اور وہ شخصیتیں ہمیں بہت کھلتی ہیں جو ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہوتی ہیں اور جن کی خصوصیات یوں مربوط ہوتی ہیں کہ ایک خصوصیت کو دوسری سے الگ کرو تو ایسی ٹیس سی اٹھے جیسے گوشت سے ناخن کو جدا کیا گیا ہے۔

ابنِ انشا ایک ایسی ہی مربوط اور ہمہ گیر شخصیت کا مالک تھا۔ وہ بہ یک وقت بہت کچھ تھا اور بہت کچھ ہونے کے باوجود اس کی شخصیت کہیں سے بھی کٹی ہوئی اور بٹی ہوئی نہیں تھی۔ بس اتنا تھا کہ وہ جن انسانوں کا دوست تھا ان کا تو وہ دوست تھا ہی، مگر دشمن کسی انسان کا نہیں تھا ---- البتہ بعض انسانی گروہوں کے ان

نظاموں کا غیر مشروط دشمن تھا جو عامۃ الناس کو گھٹیا اور بڑھیا انسانوں میں بانٹ دیتے ہیں اور جنہیں یہ دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے---- اور یہ تکلیف انہیں سینکڑوں صدیوں سے ہو رہی ہے---- کہ عام انسانوں کی آنکھیں بھی ان کی آنکھوں کی طرح تعداد میں دو کیوں ہیں، ایک کیوں نہیں ہے---- اور اگر دو آنکھوں کے بغیر چارہ نہیں تھا تو ان کی وہ دُمیں کیوں جھڑ گئی ہیں جو تفریق و امتیاز کے لیے ضروری تھیں، اور یہ چوپایوں کی طرح پچھلی دو ٹانگوں کے علاوہ اگلے دو ہاتھوں کو بھی زمین پر ٹیک کر کیوں نہیں چلتے۔ ابنِ انشا صرف اس طرح کی سوچ رکھنے والے ''سُپر'' انسانوں کا دشمن تھا، ورنہ اس کی شخصیت میں اتنی نرمی تھی، اتنا گداز تھا، اتنی اپنائیت تھی کہ میں تو اس سے جب بھی ملا، مجھے مہاتما بدھ یاد آ گئے۔ ایسے کھرے اور بے ضرر انسان کو ابھی تیس چالیس برس اور زندہ رہنا چاہیے تھا۔

ابنِ انشا کے سے وجود ہی تو انسانی زندگی کو پُر مایہ اور تہہ دار بناتے ہیں اور انسانوں کو زندہ رہنا اور سلیقے سے زندگی گزارنا سکھاتے ہیں۔ مگر وہ، جن کی پوری میعادِ حیات، انسانی زندگی کو حسن و خیر اور شگفتگی و بے ساختگی کے ساتھ بسر کرنے کی ایک تبلیغ مجسم ہوتی ہے، جب خود مر جاتے ہیں، چاہے ابنِ انشا کی طرح ہنستے کھیلتے مر گئے ہوں، اپنے عزیزوں اور دوستوں اور پڑھنے والوں اور یاد کرنے والوں کے لیے زندگی کو ایک کربِ مسلسل میں بدل جاتے ہیں اور ہم آس پاس بکھرے ہوئے اندھیروں کو ٹٹولتے رہ جاتے ہیں کہ یہ جو ابھی ایک کوندا سا لپکا تھا، وہ تاریکی کے اس انبار میں کہاں کھو گیا۔

ابنِ انشا کی شخصیت اور ذہنیت کے تجزیے کیے جائیں گے کہ وہ جو ہر وقت ہنستا ہنساتا رہتا تھا، اندر سے کتنا گھائل تھا اور وہ جس نے شاعری اور نثر میں اپنا ایک الگ اسلوب تراش لیا تھا، داخلی طور پر کتنی محرومیوں کا شکار تھا۔ مگر مجھے ان

بزرگانِ علوم کے برعکس فقط وہ ابنِ انشا پیارا تھا جو مجھے عام زندگی میں نظر آتا تھا اور جو محبت اور دوستی کے معاملے میں اتنا وضع دار تھا کہ اس کی نیک نیتی کی قسم کھائی جا سکتی تھی اور جو ہمارے معاصر ادب کا ایک البیلا کردار تھا۔

کاش ابنِ انشا کے سے عزیز وجود کو اس دنیا سے اٹھا لے جانے والی اور ہمارے معاشرے اور ہماری تہذیب کو غریب تر کر دینے والی موت کے خلاف عدالت الٰہی میں مقدمہ دائر کیا جا سکتا!

سجاد سرور نیازی

ابھی چند ہفتے پہلے میں لاہور ٹیلی ویژن اسٹیشن کے ایک کمرے میں سے گزرا تو آواز آئی "ندیم!" پلٹ کر دیکھا تو ایک کرسی پر سجاد سرور نیازی بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ سالہا سال کے خاندانی روابط کی وجہ سے ان کی حیثیت میرے بڑے بھائی کی سی تھی۔ ہم انھیں "سرور بھائی" کہا کرتے تھے۔ اُنھوں نے مجھے سینے سے لگایا اور شکایت کی کہ لاہور میں رہتے ہوئے میں ان سے نہیں ملتا۔ میں نے اپنی بے ہنگم مصروفیتوں اور ٹرانسپورٹ کی مشکلوں کا عذر تراشا تو بولے "اچھا تو ہم سب تمھارے ہاں آئیں گے۔ پھر تم سب کو اپنے ہاں لے جائیں گے۔ زندگی کی مہلت بہت مختصر ہے ندیم، اسے ضائع نہیں جانے دینا چاہیے اور اسے کام میں لانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے پیاروں سے روابط قائم رکھیں۔ میں بھی قصوروار ہوں، تم بھی قصوروار ہو مگر تم زیادہ قصوروار ہو کیونکہ تم مجھ سے چھوٹے ہو۔"

میں نے اعترافِ جرم کیا اور پھر ان کے مشاغل کا پوچھا تو بولے "یہ دیکھو۔ بظاہر میں علمِ موسیقی پر ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں، مگر دراصل یہ موسیقی کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ تم مجھے اپنا رسالہ نہیں بھیجتے مگر میں پڑھ لیتا ہوں۔ اس میں تم موسیقی پر بھی مضامین چھاپتے ہو اس لیے تمھیں کچھ شُد بُد تو ہوگی۔ اور یہ تو میں

جانتا ہوں کہ تم کُن رس تو ہو۔ شاعر اگر کُن رس نہ ہو تو شعر کیسے کہے۔ شعر کہہ بھی لے تو اچھا شعر کیسے کہے۔ اسے ایک نظر دیکھو۔ یہ کتاب قریب الختم ہے۔ میں اسے مکمل کر لوں تو تمھیں دوں گا۔ زبان و اظہار کے سلسلے میں مجھے مشورے دینا۔ مگر تم تو مجھ سے ملتے ہی نہیں، تمھیں ہو کیا گیا ہے!" انھوں نے پھر وہی شکایت دہرائی اور میں ندامت سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

محمد اسلم خاں نیازی میرے نہایت عزیز دوست اور سجاد سرور نیازی کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ بہت اچھے آرٹسٹ تھے۔ کیڈٹ کالج حسن ابدال سے وابستہ رہے اور وہاں میانوالی کے اس (پنوں خیل) نیازی خاندان سے ہمارے خاندان کے گہرے روابط قائم ہوئے۔ اسلم نیازی ہمیں اپنے سرور بھائی کے بارے میں بتاتے رہتے تھے کہ کیسے انھوں نے خاندان کی قدامت پسندی اور روایت پرستی کے خلاف بغاوت کی اور موسیقی کی دنیا سے متعلق ہو گئے۔ پھر ہز ماسٹرز وائس کمپنی اور آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران ان کا فن اور ان کی پٹھانیت جس طرح دست و گریباں رہے اس کے کئی دلچسپ واقعات اسلم ہمیں سنا چکے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں جب میں بوجہ علالت "پھول" "تہذیب نسواں" اور "ادب لطیف" کی ادارت سے دست کش ہو کر گاؤں آ گیا تو اسلم نے مجھے اطلاع دی کہ صحت یاب ہونے کے بعد لاہور کی بجائے پشاور کا رخ کروں جہاں ان دنوں سرور بھائی آل انڈیا ریڈیو پشاور کے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ اسلم نے ان سے بات کر لی تھی اور انھوں نے مجھے بحیثیت اسکرپٹ رائٹر قبول کر لیا تھا۔

۱۹۴۶ء کے اواخر میں جب مجھے ایک حد تک افاقہ محسوس ہوا تو میں پشاور چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ میرے ساتھ سرور بھائی زیادہ سے زیادہ یہ رعایت برتیں گے کہ ریڈیو کی تکنیک سمجھا دیں گے مگر انھوں نے تو مجھے یوں سینے سے لگا لیا جیسے میری بجائے ان کا چھوٹا بھائی اسلم پشاور آیا ہے۔ وہ مجھے اپنے بنگلے میں

لے گئے جہاں ایک کمرہ میرے لیے وقف کر دیا گیا اور میں ان کے گھرانے کے ایک فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے لگا۔ بڑی منتوں اور احتجاجوں کے بعد اُنھوں نے مجھے الگ رہنے کی اجازت دی مگر چند ہفتے گزرے تو وہ مجھے پھر اپنے ہاں اٹھا لائے۔ یوں تقریباً ڈیڑھ برس کے قیام کے دوران ایک برس تک میں اُن کے ہاں رہا۔ ہم اکٹھا کھانا کھاتے تھے' اکٹھا ریڈیو اسٹیشن جاتے تھے' اکٹھا واپس آتے تھے۔ اس عرصے میں مجھے سرور بھائی کی شخصیت کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے دیکھا کہ یہ شخص تمام و کمال آرٹسٹ ہے۔ وہ اتنا سادہ' اتنا معصوم اور دنیاداری سے اتنا بلند ہے کہ یقین نہیں آتا وہ اسٹیشن ڈائریکٹر بھی ہے۔ اس کی گھریلو زندگی مبالغے کی حد تک پُرسکون ہے مگر اس کے اندر جو فن کار ہے' وہ اسے بے چین رکھتا ہے چنانچہ کبھی وہ ستار بجا رہا ہوتا ہے' کبھی دلربا پر مشق کر رہا ہوتا ہے' کبھی اس کے سامنے طبلے کی جوڑی رکھی ہوتی ہے۔ پھر کبھی وہ ایزل پر کینوس رکھے تصویر بنا رہا ہوتا ہے' کبھی میرے ساتھ علمِ موسیقی اور علمِ عروض پر بحث کر رہا ہوتا ہے۔

۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو جب رات کے بارہ بجے آل انڈیا ریڈیو کو پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس میں بدلنا تھا تو پشاور ریڈیو اسٹیشن کا سارا اسٹاف اسٹیشن کے لان میں جمع تھا۔ سٹاف کے ایک رکن شوکت نے عمارت کی چھت پر کھڑے ہو کر ریوالور سے چند ہوائی فائر کر کے آزاد پاکستان کے قیام کا اعلان کیا۔ سرور بھائی نے سبز ہلالی پرچم لہرایا اور اس کے بعد ایک گھنٹے کا وہ ریڈیو پروگرام شروع ہوا جو میری زندگی کی چند لطیف یادوں میں سے ایک عزیز ترین یاد ہے۔ آزادی' قیامِ پاکستان اور قائدِ اعظم کی عظیم رہنمائی کے موضوعات پر سبھی ترانے میں نے لکھے' سبھی کی دُھنیں سرور بھائی نے ترتیب دیں اور ان میں سے ایک یا دو ترانے خود سرور بھائی نے گائے۔ یوں مجھے پہلی مرتبہ تجربہ ہوا کہ سرور بھائی کا

دھن ترتیب دینے کا انداز کیا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ جس طرح شاعر تخلیق شعر کے وقت ایک عجیب لذت آمیز کرب میں سے گزرتا ہے' وہی عالم سرور بھائی کا تھا۔ ۱۳۔ اگست سے پہلے کے تین چار دن اور راتیں انھوں نے اسی تخلیقی کرب میں بسر کیں اور جب یہ دھنیں مکمل ہو گئیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انھیں زندگی میں اس سے بڑی مسرت کا کبھی تجربہ نہیں ہوا۔ ان دنوں ٹیپ کا رواج نہ تھا اور ریکارڈ باتھ روک کر استعمال کیے جاتے تھے مگر کاش پشاور ریڈیو اسٹیشن میں اس رات کے ان ترانوں کے ریکارڈ محفوظ ہوں۔ سرور بھائی کے انتقال کے بعد ان کے بعض گراموفون ریکارڈوں کی دھنوں کا بہت ذکر آیا ہے مگر کاش لوگوں نے سرور بھائی کے اس روز کے یہ ترانے سنے ہوتے۔

اس کے علاوہ بھی وہ موسیقی کے پروگراموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے مگر خود صرف ۱۴۔ اگست کے ابتدائی لمحات میں گایا اور بعد کے تاثرات میں اندازہ ہوا کہ پشاور ریڈیو اسٹیشن کے اس ایک گھنٹے کے پروگرام کو کتنی منفرد حیثیت حاصل ہوئی تھی۔

مجھے وہ دن نہیں بھولیں گے جب ہم دونوں ناشتہ کرنے کے بعد سرور بھائی کی کار میں جا بیٹھتے تھے۔ یہ اتنی مختصر سی کار تھی کہ اگر آج ایسی کار پاکستان کے کسی شہر کی کسی سڑک پر دکھائی دے جائے تو اسے دیکھنے کے لیے ہجوم لگ جائے کہ آج سے نصف صدی پہلے کی کار بھٹک کر اس زمانے میں آ نکلی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں بھی ریڈیو سٹیشن کے اکا دکا اہل کاروں کے پاس کاریں تھیں اور وہ سرور بھائی کی کار کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر اور جدید تھیں مگر سرور بھائی اس سے بالکل بے نیاز' مدتوں تک اسی صندوق نما کار میں گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر آتے جاتے رہے۔

ایک بار اسلم بھائی پشاور آئے۔ جب ہم دفتر جانے لگے تو سرور بھائی

نے اسلم کو کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا مگر اسلم نے معذرت کر لی اور کہا ''میں پچھلی سیٹ پر تو بالکل نہیں بیٹھوں گا۔ کار اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ میں ڈرتا ہوں کہیں کوئی کھڈ وڈ آ گیا تو وہ حصہ جس میں آپ اور ندیم بیٹھے ہیں، پچھلے حصے سے کٹ کر الگ ہو جائے۔ آپ آدھی کار میں بیٹھے ریڈیو اسٹیشن جا پہنچیں گے اور میں پچھلے حصے سمیت ہی سڑک پر پڑا رہ جاؤں گا۔ اس کار ہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ سرور بھائی سماجی مرتبے کے نمائشی اظہار سے کتنے بے نیاز تھے۔

سادگی ان کے مزاج کا نمایاں ترین جوہر تھی اور پھر وہ اس انتہا کے حساس تھے کہ ایک بار جب ہم لوگ گھر کے اندر کسی فنی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے، سرور بھائی کی بچیاں دیوار کے ساتھ اپنی گڑیاں سجا کے بیٹھی تھیں۔ یکایک گڑیوں کی شادی کے سلسلے میں وہ آپس میں اُلجھ پڑیں۔ سرور بھائی نے انھیں روکا مگر جب ان کا جھگڑا جاری رہا (آخر رشتے کا جھگڑا تھا) تو سرور بھائی کے اندر کا پٹھان جاگا۔ اُنھوں نے لوہے کی استری اٹھائی اور بچیوں کے ان ٹین کے بکسوں پر، جن میں ان کی گڑیاں بھری رہتی تھیں، استری کی اتنی بے تحاشا ضربیں لگائیں کہ سب پچک گئے اور خود سرور بھائی بھی اپنے ہاتھ کو زخمی کر بیٹھے۔

اس کے برعکس دوسری انتہا ملاحظہ ہو کہ ایک بار میرے ایک ملازم (غلام محمد) نے مجھے بتایا کہ اس سے ایک غلطی ہوگئی ہے اور سرور بھائی اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیتے۔ اس نے کہا کہ میری سفارش کیجیے اور معافی دلوا دیجیے۔ میں سرور بھائی کے مزاج سے واقف تھا، اس لیے غلام محمد کو ہدایت کی کہ وہ خود جا کر معافی مانگ لے اور اگر ایسا کرتے ہوئے وہ آنکھوں سے دو آنسو نہیں گرا سکتا تو کم سے کم اس کی آواز ضرور بھرّا جائے۔ غلام محمد نے ایسا ہی کیا۔ اس نے سلام کیا تو اسے کوئی جواب نہ ملا۔ بھرّائی ہوئی آواز میں معافی مانگی تو سرور بھائی چونک کر اٹھے، اس کی پیٹھ کو تھپتھپایا اور بولے ''کوئی بات نہیں غلام محمد

کوئی بات نہیں۔ تم روؤ نہیں۔ میں قیامت کے روز دوسروں کے آنسوؤں کا جواب دہ نہیں ہونا چاہتا!'' تب سے پشاور سے میرے ''فراز'' تک سرور بھائی کو غلام محمد سے کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی۔

یہاں تو بعض لوگوں کی طینت ہی میں بدخواہی ہوتی ہے اور وہ بے چارے مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے محسنوں کو بھی دھوکا دیں۔ چنانچہ ممکن ہے سرور بھائی کے سٹاف میں کوئی اکا دکا کالی بھیڑ موجود ہو مگر ڈیڑھ برس کے قیام پشاور کے دوران میں نے ایک بار بھی سرور بھائی کو اپنے کسی ماتحت پر غصے ہوتے نہ دیکھا۔ پھر وہ دن آیا جب پشاور میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ ایک دم بھڑک اٹھی اور دیکھتے دیکھتے شہر اور صدر کی کتنی عمارتوں میں سے شعلے نکلنے لگے اور ہر طرف فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ شاید اتوار کا دن تھا۔ سرور بھائی کی ننھی بچیاں بھی بچوں کے پروگرام میں حصہ لینے ریڈیو اسٹیشن پہنچیں' میں ان کے ہمراہ تھا۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد جب میں بچیوں کو ساتھ لیے ایک وین میں واپس آ رہا تھا تو فساد شروع ہو چکا تھا۔ صدر میں داخل ہوئے تو گولیوں کی تڑاتڑ سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ میرے علاوہ بچیاں بھی خوف زدہ تھیں۔ تب ایک ہوٹل کے سامنے جس کا نام اِس وقت بھول رہا ہوں' میں نے وین رکوائی اور بچیوں کو ہمراہ لیے پشاور ریڈیو کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر حضرت ن۔م۔راشد کے کمرے میں جا گھسا۔ ہم دونوں نے بچیوں کو پلنگ پر لٹا دیا تاکہ گولیوں کے اس طوفان میں کوئی بھٹکی ہوئی گولی ہوٹل کے اس کمرے کی کھڑکی کا رخ نہ کرلے۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ سرور بھائی کو اپنی بچیوں کی فکر ہوگی۔ میں نے ہوٹل کے دفتر میں جا کر فون کیا تو انھوں نے بڑے پُرسکون لہجے میں جواب دیا ''مجھے پریشانی کی کیا ضرورت ہے۔ میں جانتا ہوں تم ان کے ساتھ ہو۔ آخر باپ اور چچا میں فرق ہی کیا ہوتا ہے۔ سکون ہو جائے تو میں ریڈیو سٹیشن کی کار

باقاعدہ گارڈ کے ساتھ بھیجوں گا تا کہ تم لوگ بحفاظت گھر پہنچ جاؤ۔ مگر ندیم یہ جو مر رہے ہیں اور یہ جو جل رہے ہیں، تو کیا ان کو مارے اور جلائے بغیر ہمارے ایمان اُدھورے رہ جاتے؟ ہم تو اسلام کے پیروکار ہیں اور اسلام تو سلامتی کا مذہب ہے۔ ہمیں تو ان لوگوں کو پناہ دینی چاہیے تھی۔۔۔۔!"

ان کی آواز میں کتنا درد تھا! اُس وقت موسیقار سجاد سرور بول رہا تھا۔۔۔۔ ایک فن کار جو جبر، ظلم اور زیادتی کا دشمن ہوتا ہے اور جو دُنیا میں صرف امن، سکون، انصاف، دیانت اور خوش حالی کو عام دیکھنا چاہتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک یہی حُسن ہے اور یہی نیکی ہے۔ سرور بھائی ان معنوں میں بے حد نیک انسان تھے اور مجھے یقین ہے کہ ان کی ہونہار بچیاں اپنے قابل فخر باپ کی عظمت کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

محمد طفیل

طفیل صاحب کے ساتھ میرے تعلقات کی تاریخ نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں جب میں سب انسپکٹر آبکاری کی ملازمت ترک کر کے لاہور آیا اور سید امتیاز علی تاج کے اشاعتی ادارے دارالاشاعت پنجاب کی طرف سے شائع ہونے والے دو مشہور ہفت روزوں---''پھول'' اور''تہذیبِ نسواں'' ---کی ادارت سنبھالی تو اُنھی دنوں طفیل صاحب سے تعارف ہوا۔ وہ ان کے اور میرے ایک مشترکہ دوست لطیف فاروقی مرحوم کے ہمراہ میرے پاس تشریف لائے اور اشاعت کے لیے میرے کسی مجموعے کی فرمائش کی۔ ویسے تو وہ ان دنوں اندرون لوہاری دروازہ کی اُس بیٹھک میں کتابت کرتے تھے جہاں تاج الدین زریں رقم کی رہنمائی میں نستعلیق اور نسخ کتابت کی ایک تربیت گاہ چل رہی تھی۔ اسی بیٹھک میں تربیت حاصل کر کے حافظ یوسف سدیدی مرحوم کے سے وہ خطاط منظرِ عام پر آئے جنھوں نے اس فنِ شریف کی عظمتوں اور خوب صورتیوں میں بے پناہ اضافے کیے۔ طفیل صاحب بھی زریں رقم کے نہایت ذہین شاگردوں میں شمار ہوتے تھے اس لیے اگر کتابت بھی کرتے رہتے تو بڑے نامور ہوتے۔ مگر قدرت نے انھیں ایک اور عظیم کام کے لیے چُن رکھا تھا۔ اُس زمانے میں طفیل

صاحب اتنے دبلے پتلے تھے کہ محسوس ہوتا تھا' ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تو ان کے قدم اکھڑ جائیں گے۔ وہ ہمیشہ شلوار قمیص میں ملبوس رہتے تھے اور اگر اس سے دو برس پہلے منٹو اور کرشن چندر نے دہلی میں مجھے کوٹ پتلون پہننا اور ٹائی باندھنا سکھا نہ دیا ہوتا تو میں بھی انھیں شلوار قمیص میں ہی ملبوس ملتا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ان دنوں میں خاصا تندرست نوجوان تھا۔ میرے بازوؤں میں مچھلیاں تھیں اور میری ٹھوڑی دوہری تھی۔ یوں سمجھیے کہ اُن دنوں میری صحت بالکل ویسی تھی جیسی انتقال سے چند برس پہلے طفیل صاحب کی صحت تھی اور رُبع صدی پہلے طفیل صاحب بالکل ایسے ہی دبلے پتلے تھے جیسے ان دنوں میں ہوں۔ خدانخواستہ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ طفیل صاحب نے میری صحت مجھ سے چھین لی' اس لیے کہ صحت کا انحصار موٹاپے اور دبلاپے پر نہیں ہوتا۔ میں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ ہم دونوں میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں---- جسمانی لحاظ سے بھی اور نظریاتی و جذباتی لحاظ سے بھی۔ اگر کسی چیز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو وہ طفیل صاحب کی اور میری دوستی کا رشتہ تھا جو کئی بار طنبورے کے تار کی طرح تن گیا مگر ٹوٹا ایک بار بھی نہیں کہ اس کے ٹوٹنے کا احتمال ہی ختم ہو چکا تھا۔

میں نے طفیل صاحب کو اپنے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''کیسر کیاری'' پیش کر دیا۔ یہ نام میرے استادِ گرامی حضرت مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے منتخب کیا تھا۔ فرماتے تھے کہ ''زعفران زار'' کا اس سے بہتر اُردو ترجمہ ممکن ہی نہیں۔ (یہ مجموعہ میرے ابتدائی مزاحیہ مضامین اور بعض تراجم پر مشتمل تھا۔ البتہ ابھی دو چار برس پہلے میں نے اپنے مزاحیہ کالموں کا انتخاب اِسی نام سے شائع کر دیا اور یوں میرا وہ ابتدائی مجموعہ پس منظر میں چلا گیا)۔ جس ادارے نے میری یہ کتاب شائع کی تھی اس کا نام مکتبۂ شعر و اَدب یا اسی طرح کا کوئی نام تھا' بہرحال ادارۂ فروغ اُردو نہیں تھا۔ طفیل صاحب نے یہ ادارہ بعد میں قائم کیا اور اس ادارے میں کوئی

دوسرے صاحب ان کے شریکِ کار نہیں تھے۔ میں نے کچھ عرصے بعد دارالاشاعت کے متذکرہ دو ہفت روزوں کے علاوہ ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' کی ادارت بھی سنبھال لی اور ۱۹۴۵ء تک یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اس دوران طفیل صاحب سے قریب قریب روزانہ ملاقات ہوتی رہی۔ میں اندرون بھاٹی دروازہ میں کئی بار ان کے آبائی مکان میں بھی گیا۔ وہ گھر تو بہت مختصر سا تھا مگر اس کے مکین بڑے فراخ دل اور محبت کرنے والے لوگ تھے۔ میں نے وہاں کتنی ہی شامیں اس گھر کے ایک فرد کی طرح گزاریں اور طفیل صاحب کے علاوہ ان کے بزرگوں اور بھائیوں کی محبتیں وصول کرتا رہا۔

''کیسر کیاری'' کے بعد انھوں نے میرے متعدد مجموعے---''رم جھم'' اور ''آنچل'' اور ''آبلے'' اور ''بازارِ حیات'' شائع کیے مگر میرے ناشرین میں سے یہ واحد ناشر ہیں کہ جس طرح وہ میرے پہلے مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں میری توقعات پر صد فی صد پورے اترے، اسی طرح دوسرے مجموعے کے سلسلے میں بھی انھوں نے اپنے خلوص و دیانت کا معیار برقرار رکھا اور یہ معمولی بات نہیں ہے۔ ایک مصنف اگر یہ کہتا ہے کہ اسے فلاں ناشر سے تمام عمر کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی تو یہ معمولی بات نہیں ہے۔ آج کل خود میں ایک چھوٹا سا ناشر ہوں اور ہزار احتیاط کے باوجود اُن خواتین و حضرات کی بعض شکایات کا ہدف بنتا رہتا ہوں جن کے مجموعے میں نے شائع کیے ہیں۔

میں ۱۹۴۵ء میں اعصابی تھکن کا شکار ہو کر گاؤں چلا گیا تو جب بھی طفیل صاحب مجھے اپنے خوب صورت خطوں کے ذریعے دلاسے دیتے رہے۔ صحت یاب ہو کر میں آل انڈیا ریڈیو پشاور سے بحیثیت مسودہ نویس وابستہ ہوگیا اور ۱۹۴۶ء میں پشاور منتقل ہوگیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد چودھری نذیر احمد نے رسالہ ''سویرا'' جاری کرنے کا اہتمام کیا اور پشاور آکر اس کی ادارت میرے سپرد کر گئے۔

''سویرا'' کے ابتدائی تین شمارے میں نے ہی مرتب کیے۔ یہ سلسلہ شاید جاری رہتا اگر میں مستقل طور پر لاہور منتقل نہ ہوتا۔

جب بہن خدیجہ مستور اور بہن ہاجرہ مسرور لکھنؤ میں تھیں اور بعد میں بمبئی چلی گئی تھیں تو ''ادبِ لطیف'' کے مدیر کی حیثیت سے ان کے ساتھ خط و کتابت رہی۔ پھر یہ تعلقات اتنے بڑھے کہ ہم لوگ بھائی بہن کے رشتے میں مُنسلک ہوگئے۔ چنانچہ جب قیامِ پاکستان کے بعد ان بہنوں کا خاندان ہجرت کر کے لکھنؤ سے بمبئی ہوتا ہوا پہلے کراچی اور پھر لاہور آیا تو مجھے طفیل صاحب ہی نے لاہور میں ان کی آمد کی اطلاع دی۔ میں پشاور سے لاہور پہنچا تو طفیل صاحب ہی مجھے نسبت روڈ کے اس مکان پر لے گئے جہاں میں بعد میں سولہ برس تک اپنے اہلِ خانہ سمیت مقیم رہا اور جو اَب مشہور شاعر خالد احمد کی ملکیت ہے۔ انھی دنوں طفیل صاحب نے اِس شرط کے ساتھ ایک اَدبی رسالہ جاری کرنے کا ارادہ ظاہر کیا کہ اس کی ادارت بہرصورت مجھے اور میری ادیب بہنوں میں سے کسی ایک کو سنبھالنی تھی۔ میں نے رسالے کا نام ''نقوش'' تجویز کیا۔ طفیل صاحب کو اس کا ڈیکلریشن بھی مل گیا۔ ہاجرہ بہن اور میں اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہ ہم تینوں کا مشترکہ رسالہ تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ ہم دونوں اپنی ایک ایک کتاب طفیل صاحب کے اشاعتی ادارے کی نظر کر دیں گے اور ان کا معاوضہ رسالے کے دو حصے شمار ہوگا۔ تیسرے حصے کی ملکیت طفیل صاحب کی ہوگی۔ وہی رسالے میں سرمایہ لگائیں گے اور رسالے کے مہتمم یا منیجر ہوں گے۔ ۱۹۴۸ء میں جب ''نقوش'' کا پہلا شمارہ ''زوبی'' کے سرورق کے ساتھ افقِ ادب پر طلوع ہوا تو صائب الرائے اصحاب نے غیر مشروط طور پر اعلان کر دیا کہ ''نقوش'' پاکستان کے اُردو شعر و ادب کی ترجمانی کا فرض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرے گا۔ اس لیے میں نے اس کی پیشانی پر ''زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا ترجمان'' کے الفاظ درج کیے تھے۔

ارباب حکومت کو ہمارا زندگی آمیزی اور زندگی آموزی کا پروگرام پسند نہ آیا اور کچھ وہ عناصر بھی بہت زوروں میں تھے جو ادب کو زندگی کی ''آلائشوں'' سے آلودہ کرنے کے سخت مخالف تھے۔ ساتھ ہی ہم مدیران ''نقوش'' یعنی میں اور بہن ہاجرہ مسرور انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ تھے بلکہ اس کے عہدہ دار بھی تھے اس لیے خفیہ پولیس کے اہل کاروں نے ادارۂ فروغ اُردو کے باہر مستقل ڈیرا ڈال دیا تھا۔ طفیل صاحب اس صورت حال سے پریشان تو تھے مگر ساتھ ہی وہ ہماری محبت میں بھی مبتلا تھے اور ''نقوش'' کو جاری رکھنے کے بھی خواہشمند تھے' چنانچہ اس عرصے میں وہ حالات کا مطالعہ خاموشی اور سنجیدگی سے کرتے رہے۔ میں نے منٹو کا ایک افسانہ ''کھول دو'' ''نقوش'' میں درج کیا تو حکومت کو حملہ آور ہونے کا بہانہ مل گیا۔ چنانچہ اس افسانے کے حوالے کے بغیر ''نقوش'' کو (اور ساتھ ہی کسی بہانے ''ادبِ لطیف'' اور ''سویرا'' کو بھی) سیفٹی ایکٹ کے تحت چھ ماہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

ہم نے ان چھ ماہ میں آئندہ شماروں کی تیاریاں جاری رکھیں۔ پابندی ختم ہوئی تو ''نقوش'' کے ''جشنِ آزادی نمبر'' اور ''عالمی امن نمبر'' کی سی خصوصی اشاعتوں نے اس رسالے کا قد مزید بڑھا دیا۔ پھر نومبر ۱۹۴۹ء میں وہ کُل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سارے ملک کے ترقی پسند اہلِ قلم جوق در جوق شامل ہوئے مگر ساتھ ہی انتہا پسندی کا شکار ہو گئے اور بعض ایسے فیصلے کر ڈالے جنہیں کچھ ہی عرصے بعد نامناسب قرار دے دیا گیا۔ مجھے اس کانفرنس میں کُل پاکستان انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا تھا۔ یہ فیصلہ سونے پر سہاگے کا کام کر گیا اور یہ انھی دنوں کا ذکر ہے جب طفیل صاحب نسبت روڈ کے مکان پر میرے پاس آئے اور ''نقوش'' کو عملاً بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے واضح طور پر کہہ دیا کہ ہماری شخصی محبت اپنی جگہ مگر خفیہ

پولیس کی مسلسل دھمکیاں اور پوچھ گچھ کا لامتناہی سلسلہ اب ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے اس لیے رسالے کو موجودہ صورت میں جاری رکھنا ناممکن ہوگیا ہے۔ جب ''نقوش'' کا دسواں شمارہ شائع ہوا تو طفیل صاحب نے محسوس کیا کہ یہ لوگ تو شاید کشتیاں جلا کر آئے ہیں اور ان کی شدّت کا ساتھ ناممکن ہو چلا ہے۔ ہم لوگ روپے پیسے سے محروم تھے۔ ہمارے پاس تو صرف ایک ہی دولت تھی اور وہ ہمارا قلم تھا۔ اتفاق سے اس وقت ہاجرہ بہن گھر میں موجود نہ تھیں ورنہ جارحانہ بحث مباحثے کا ایک طویل دور شروع ہوسکتا تھا۔ طفیل صاحب کی سیاسی بے بسی اور اپنی اقتصادی بے بسی کا تقاضا یہی تھا کہ اس اشتراک کوختم کر دیا جائے۔ میں اوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں جا کر معاہدے کی وہ نقل اٹھا لایا جو''نقوش'' کی ملکیت کے اشتراک سے متعلق تھی۔ پھر میں نے طفیل صاحب کے سامنے اسے پھاڑ کر پھینک دیا اور عرض کیا کہ آپ بھی مجبور ہیں، ہم بھی مجبور ہیں۔ مگر انسانی سطح پر ہمارے تعلقات میں کوئی رخنہ نہیں پڑنا چاہیے۔ طفیل صاحب کے خیالات بھی ایسے ہی تھے چنانچہ اتنے بڑے المیے کے بعد بھی ہم اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ بعد میں جب ہاجرہ بہن گھر آئیں اور میں نے انھیں اس حادثے کی اطلاع دی تو وہ اس حد تک آزردہ ہوئیں جیسے ہمارے کسی پیارے عزیز کا انتقال ہوگیا ہے۔ پھر وہ مجھے ساتھ لے کر طفیل صاحب کے پاس بھی گئیں اور وہاں دل کی بھڑاس نکالی۔ مگر ہماری طرح ان کے سامنے بھی اشتراکِ عمل کا کوئی فارمولا نہ تھا اور ترقی پسند ادب کی تحریک سے ہماری کومٹمنٹ اٹل تھی، اس لیے کسی سمجھوتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بعد میں ''نقوش'' سید وقار عظیم کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ ہمارے زخم تازہ تھے اس لیے ''نقوش'' کی چند اشاعتیں ہماری تحریروں سے خالی رہیں مگر کچھ عرصہ بعد ہم دونوں نے ''نقوش'' میں مسلسل لکھا اور آخر تک لکھا۔ یہ اس

محبت کے رشتے کی فتح تھی جس میں ہم دونوں کے علاوہ طفیل صاحب بھی بصمیم قلب منسلک تھے۔ طفیل صاحب سے ہماری ملاقاتیں کم ہوگئی تھیں مگر طویل وقفوں کے بعد جب بھی ملاقات ہوتی تھی ہم دیر دیر تک اس محترم رشتے پر سے واقعات وحالات کی اڑائی ہوئی گرد کو جھاڑتے رہتے تھے اور جب الگ ہوتے تھے تو دلوں پر میل کا کوئی ذرا سا بھی دھبہ انھیں ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ طفیل صاحب کے دم آخر تک جاری رہا۔

یہاں میں اپنے ایک مضمون کا اقتباس دینا پسند کروں گا جو میں نے طفیل صاحب کی موجودگی میں ۸۔ اگست ۱۹۸۵ء کو ''نقوش'' کے سالنامے کی اشاعت کی تقریب منعقدہ واپڈا آڈیٹوریم میں پڑھا تھا:

''۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۹ء تک کے پانچ چھ برسوں میں طفیل صاحب نے بے خیالی میں بھی مجھ پر اس امر کا کوئی ثبوت افشا نہ کیا کہ ان کے اندر ایک مدیر اور ادیب چھپا بیٹھا ہے۔ ''نقوش'' سے میری اور ہاجرہ بہن کی علیحدگی کے بعد انھوں نے دو تین مدیر آزمائے مگر پھر یکایک ایک روز ''نقوش'' کا ایک شمارہ ملا جس پر مدیر کی حیثیت سے ''محمد طفیل'' کا نام درج تھا۔ میں سوچنے بیٹھ گیا کہ طفیل صاحب نے یہ اپنا ہم نام ––– محمد طفیل ––– کہاں سے ڈھونڈ نکالا جسے انھوں نے اتنے بڑے ادبی رسالے کی ادارت سونپ دی ہے۔ پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ یہ مدیر محمد طفیل تو اپنے طفیل صاحب ہی ہیں۔ یقین نہیں آیا کیونکہ طفیل صاحب نے اِس یقین کے لیے میرے ذہن میں زمین ہی تیار نہیں کی تھی۔ سچی بات ہے اس روز میں ''نقوش'' کے مستقبل سے متعلق تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ میں نے سوچا' ٹھیک ہے' طفیل صاحب رسالے کے مالک ہیں مگر ہر مالک' مدیر کا منصب تو ادا نہیں کرسکتا۔ ایک اعلیٰ پائے

کے مدیر کے اندر تو یہ خصوصیت ہونی چاہیے اور وہ خصوصیت ہونی چاہیے اور اپنے طفیل صاحب تو سیدھے سادے شرمیلے شرمیلے، لجائے لجائے سے نوجوان ہیں جو اچھے شعر کی داد بھی یوں دیتے ہیں جیسے درد سے کراہ رہے ہوں۔ مگر جب ''نقوش'' کے بھاری بھرکم شمارے آنے لگے تو مندرجات کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ طفیل صاحب میں ایک عمدہ مدیر کی متعدد خوبیاں موجود ہیں۔ انھیں ادبی تخلیقات کو پرکھنا آتا ہے اور ان کے پاس شعر و افسانہ اور تنقید و تحقیق کی معیاری کسوٹیاں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے ادیب ہونے کا ثبوت یوں فراہم کر دیا کہ چند ہم عصر ادیبوں کے خاکوں پر مشتمل ان کا ایک مجموعہ ''صاحب'' کے نام سے شائع ہوگیا . . . طفیل صاحب نے خاکہ نگاری کا ایک اپنا اسلوب وضع کیا اور اس میدان میں بھی بڑے بڑوں سے اپنی انفرادیت تسلیم کرا لی اور پھر ''نقوش'' کے نمبروں کا سیلاب آ گیا . . . میں سوچتا ہوں اگر میں ۱۹۴۹ء کے بعد بھی ''نقوش'' کا مدیر رہتا اور طفیل صاحب مجھ سے (اپنے بے شمار مرتّب کردہ نمبروں میں سے) کوئی ایک بھی نمبر مرتّب کرنے کی فرمائش کرتے تو میں بھاگ کھڑا ہوتا۔ بھاگتا یوں کہ میرے معیاروں کے مطابق ادارتی لحاظ سے میری کومٹمنٹ صرف تخلیقی ادب سے ہے اور وہ بھی بیشتر معاصر تخلیقی ادب سے۔ پھر ''نقوش'' کے سب تحقیقی نمبر مرتّب کرنے کے لیے جس جانکاہی اور ناقابلِ شکست استقامت اور تلاش و جستجو اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے وہ طفیل صاحب کے ہاں بدرجۂ اتم موجود تھی اور میں تحقیق کے ساتھ اس حیرت انگیز شغف کا احترام تو یقیناً کرتا ہوں مگر اس سے بدکتا بھی ہوں۔ طفیل صاحب نے ''نقوش'' کے

متنوع نمبروں کے ذریعے اُردو ادب اور ہماری تہذیب و ثقافت کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کی تحسین سینکڑوں نے کی ہے اور وہ اس ہمہ جہت تحسین کے ہر طرح مستحق ہیں۔ جب میں اس ننھی سی بات کو اپنا ایک اعزاز قرار دیتا ہوں کہ ''نقوش'' کا نام میں نے رکھا اور اس کا پہلا مدیر میں تھا تو طفیل صاحب ''نقوش'' کی ان کارکردگیوں اور کارگزاریوں پر کیوں فخر نہ کریں جنھوں نے ہمارے علم و ادب کو زیادہ تہہ دار اور ہماری علمی و ادبی تاریخ کو زیادہ باوقار بنایا ہے۔''

طفیل صاحب کے بارے میں میرا ایک مفصل مضمون ڈاکٹر سید معین الرحمن کی مرتب کردہ کتاب ''محمد نقوش'' میں شامل ہے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ طفیل صاحب کی شخصیت میں کتنی سادگی اور پھر کتنی گہرائی تھی چنانچہ یہاں صرف بعض واقعات کا ذکر کروں گا۔

طفیل صاحب مبالغے کی حد تک حساس انسان تھے۔ ایک دو بار میں بھی ان کی اس انتہا درجے کی حساسیت کی زد میں آیا۔ ''نقوش'' کا طنز و مزاح نمبر شائع ہوا تو میں روزنامہ ''امروز'' کا مدیر تھا۔ طفیل صاحب نے بطور خاص فرمائش کی کہ اس نمبر پر تبصرہ میں خود لکھوں' چنانچہ میں نے لکھا اور اس نمبر کے ہر پہلو کی جی بھر کر تعریف کی' البتہ آخر میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ اس نمبر میں حاجی لق لق کے سے مزاح نویس کی کوئی ایک سطر بھی شامل نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ حاجی لق لق عوامی سطح کے ایک ہردلعزیز اور بہت پڑھے جانے والے مزاح نویس تھے اس لیے ان کے ساتھ اس بے انصافی کی تلافی ہونی چاہیے۔ طفیل صاحب میری طرف سے شاید کسی بھی قسم کے تنقیدی جملے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ غصّے میں آ کر مجھے اُس روز ایک ایسا خط لکھا جس نے مجھے دنوں تک اداس رکھا۔ خلاصہ اس خط کا یہ تھا کہ طنز و مزاح نمبر میں میرے مزاحیہ

کالم کم تعداد میں درج ہوئے ہیں اور میں اسی لیے ان پر حملہ آور ہُوا ہوں' حالانکہ میرے کالموں کا ایک معقول انتخاب اس نمبر میں شامل تھا اور میرے ذہن میں اس امر کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس واقعے کے بعد چند ماہ تک ہمارے درمیان بالمشافہ ملاقات یا خط یا ٹیلی فون تک کے ذریعے بھی کوئی رابطہ نہ رہا۔ پھر بابائے اُردو مولوی عبدالحق لاہور تشریف لائے تو میں اور ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کے مدیر سید سبط حسن اُن کے استقبال کے لیے لاہور سٹیشن پہنچے۔ وہاں طفیل صاحب بھی موجود تھے۔ مصافحہ ہُوا اور طرفین کے گلے شکوے کچھ کہے سنے بغیر دور ہو گئے۔

بعض عناصر جب بھی ''نقوش'' کے کسی نمبر یا طفیل صاحب کی کسی تصنیف کے بارے میں اظہار رائے کریں گے تو اس بات کا حوالہ ضرور دیں گے کہ طفیل صاحب نے تو کسی زمانے میں کتابت بھی کی ہے۔ بزعمِ خویش' وہ اس طرح طفیل صاحب کی تضحیک کرتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ اس طرح تو وہ اس شخص کی محنت اور لگن اور استقامت کا اعتراف کر رہے ہیں۔ اگر طفیل صاحب نے کسی زمانے میں کتابت بھی کی ہے تو کون سا چھوٹا کام کیا ہے؟ کتابت تو ایک معزز اور محترم فن ہے اور مسلمانوں کے سرمایۂ فن میں تو کتابت کے شاہکاروں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ تو وہ فن ہے جسے بادشاہوں تک نے اختیار کرنے میں عزت محسوس کی اور ابھی ایک صدی پہلے تک کوئی شخص اُس وقت تک صحیح معنوں میں پڑھا لکھا نہیں کہلا سکتا تھا' جب تک وہ دوسرے فنون کے علاوہ کتابت پر بھی حاوی نہیں ہوتا تھا۔ پھر اگر یہ فن محض اس لیے حقیر ہے کہ اس سے متعلق فن کار مالی لحاظ سے عموماً آسودہ نہیں ہوتے تو پھر فنِ شاعری بھی قابلِ مذمت ٹھہرتا ہے کہ اس سے تو کتابت جتنی آمدنی بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اور پھر ہم میں سے بے شمار ایسے ہیں جن کے اجداد سپاہی تھے یا پٹواری تھے یا اسکول ٹیچر تھے یا نمک مرچ بیچنے والے دُکاندار تھے۔ خود میرے اجداد کسان تھے اور کڑکتی دھوپ میں ہل

چلاتے تھے۔ پھر ہم تو اُس پیغمبر کی اُمت میں شامل ہیں جنھوں نے بکریاں چرائی تھیں۔ آخر ہم ادیبوں نے عزت اور وقار کے معیاروں میں زر و دولت کو کب سے شامل کر لیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں یہ طفیل صاحب کی مستقل مزاجی اور جوانمردی تھی کہ انھوں نے ایک کاتب کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا اور آخر میں وہ ملک کے چند بڑے اشاعتی اداروں میں سے ایک ادارے کے مالک تھے۔ انھیں جو آسودگی حاصل ہوئی وہ کسی کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے بعد حاصل نہیں ہوئی اور انھوں نے علمی و ادبی حلقوں میں جو نام پیدا کیا، وہ یونہی راہ چلتے نہیں پیدا کر لیا تھا بلکہ انھوں نے یہ نام اپنی حیرت انگیز محنت اور جفاکشی سے باقاعدہ کمایا۔ اگر لوگ انھیں کھل کر داد دینے سے اس لیے ڈرتے تھے کہ اس طرح ان کی شخصیتوں میں کوئی کمی واقع ہو جائے گی، تو پھر ان کے کارناموں کی نفی کر کے بھی ہم اپنی شخصیتوں کے خلاؤں کو نہ صرف پُر نہیں کر سکتے بلکہ انھیں اور ہولناک بنا ڈالتے ہیں۔

پھر جب میں مجلس ترقی ادب کا ناظم مقرر ہوا تو ایک بار طفیل صاحب کو بھی مجلس کا ایک رکن نامزد کیا گیا۔ وہ مجلس کے سہ ماہی جلسوں میں شرکت کرتے رہے۔ ایک اجلاس میں جب چھاپے خانوں کے نرخ بڑھانے کا مسئلہ درپیش تھا تو طفیل صاحب نے کہا کہ وہ ان نرخوں سے بھی کم نرخوں پر مجلس کی کتابیں طبع کرا سکتے ہیں، جو مجلس آج کل ادا کر رہی ہے۔ جسٹس ایس۔اے۔رحمٰن مجلس کے صدر بھی تھے اور اس اجلاس کی بھی صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے اس پیشکش کا خیرمقدم کیا اور مجھے ہدایت کی گئی کہ مطابع کے سلسلے میں طفیل صاحب سے رجوع کیا کروں۔ میں نے ایسا ہی کیا مگر اس طرح مجلس کی مطبوعات کی رفتار میں تشویشناک کمی واقع ہوگئی کیونکہ بہ یک وقت چار پانچ پریس طفیل صاحب کی بات ماننے پر تیار نہیں تھے۔ شاید ایک پریس مانا تھا مگر سال میں دس بارہ کتابیں

صرف ایک پریس سے طبع کرانا مشکل تھا۔ میں نے اگلے اجلاس میں یہ صورتِ حال اجلاس کے سامنے رکھی تو طفیل صاحب خفا ہوگئے۔ بعد کے ایک اجلاس کے لیے انھیں مطلع کیا گیا تو انھوں نے صدر مجلس جسٹس رحمٰن صاحب کو براہِ راست خط لکھ ڈالا جس میں وضاحت کی گئی کہ ندیم صاحب ویسے تو ہر طرح ٹھیک ٹھاک ہیں مگر انتظامی معاملات میں کوتاہ ہیں اور اپنے عملے پر زیادہ تکیہ کرتے ہیں اس لیے میں احتجاجاً آئندہ کسی اجلاس میں شرکت نہیں کروں گا۔ اس پر جسٹس رحمٰن نے انھیں جو خط لکھا وہ حیرت انگیز منصفانہ توازن کا آئینہ دار تھا۔ اس میں انھوں نے واضح طور پر میری مدافعت کرتے ہوئے بھی طفیل صاحب کے لیے شکایت کی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ اس کے باوجود طفیل صاحب مسلسل غیرحاضر رہے مگر جب میری میعادِ نظامت میں اضافے کا مسئلہ درپیش ہوا تو وہ میرے حق میں ووٹ دینے کے لیے کسی تاخیر کے بغیر تشریف لے آئے اور دونوں روٹھے ہوئے، کسی رسمی معذرت وغیرہ کے بغیر، پھر سے دوستانہ بلکہ برادرانہ تعلقات کی استواری میں لگ گئے۔

بعض صورتوں میں طفیل صاحب اپنے عزیز دوستوں کو ممنون کرنے کے لیے بڑے ایثار سے کام لیتے تھے۔ صرف ایک دو مثالیں عرض کروں گا۔ ایک بار میرے ایک محترم دوست، جن کا ادب کی تنقید میں بڑا نام ہے (اور جن کا نام لینا مناسب نہیں معلوم ہوتا) میرے گھر تشریف لائے اور بتایا کہ طفیل صاحب کسی وجہ سے ان کے سخت مخالف ہوگئے ہیں۔ انھیں کراچی کے ایک صاحب کے توسط سے چند ایسے خطوط حاصل ہوگئے ہیں جو نقاد موصوف نے بابائے اُردو کو لکھے تھے اور جن میں اہلِ پنجاب کے متعلق بعض قابلِ اعتراض جملے بھی درج ہوگئے تھے۔ میرے دوست نے مجھے بتایا کہ طفیل صاحب ''نقوش'' کے آئندہ شمارے میں یہ خطوط شامل کررہے ہیں۔ میں نے انھیں وہیں اپنے گھر میں بٹھا کر دفتر ''نقوش''

کی راہ لی۔ خوش قسمتی سے طفیل صاحب اس وقت تنہا تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس اس نوعیت کے خطوط موجود ہیں؟ بولے : ''جی ہاں موجود ہیں۔'' میں نے پوچھا کہ کیا آپ انھیں ''نقوش'' میں درج کر رہے ہیں؟ بولے : ''ہر صورت میں درج کروں گا۔'' میں نے عرض کیا کہ آپ ایسا نہیں کریں گے۔ انھوں نے بڑے دکھ اور حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پھر میز کا ایک دراز کھول کر ایک پوسٹ کارڈ نکالا اور بولے : ''مشتے نمونہ از خروارے' اسے پڑھ لیجیے۔'' یہ نقاد موصوف کا خط مولوی عبدالحق صاحب کے نام تھا۔ اس میں انھوں نے مولوی صاحب کو پنجابیوں سے خبردار رہنے کو کہا تھا اور ساتھ ہی پنجابیوں کے بارے میں ایسی ناگفتہ بہ باتیں لکھی تھیں کہ قطعی طور پر بے تعصب ہونے کے باوجود میرا سارا خون جیسے میرے سر میں جمع ہوگیا۔ طفیل صاحب نے میری حالت دیکھی تو پوچھا ''کیا اب بھی آپ ''نقوش'' میں ان خطوط کو درج نہ کرنے کا مطالبہ کریں گے؟'' میں نے کہا کہ ''اب تو میں کسی صورت میں انھیں ''نقوش'' میں درج نہیں ہونے دوں گا کیونکہ ان کی اشاعت سے پنجاب میں اُردو بولنے والے حضرات کے خلاف غم و غصے کی ایک لہر دوڑ جائے گی اور ایک شخص کی جلد بازی کی سزا سینکڑوں ہزاروں کو ملنے لگے گی۔ ویسے بھی اہل پنجاب بحیثیتِ مجموعی اس طرح کے صوبائی اور علاقائی تعصبات سے محفوظ ہیں اور اگر یہ خطوط چھپ گئے تو ان کی بے تعصبی حد درجہ متاثر ہوگی۔'' طفیل صاحب ان خطوط کی اشاعت پر تلے ہوئے تھے مگر جب میں نے واضح کیا کہ ان پر اور ''نقوش'' پر میرے بے شمار حقوق ہیں تو انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور قسم کھا کر مجھے یقین دلایا کہ یہ خطوط ''نقوش'' میں نہیں چھپیں گے---- اور واقعی یہ خطوط ''نقوش'' میں کبھی شائع نہ ہوئے۔ یوں طفیل صاحب نے مجھے حد درجہ ممنون کیا۔ ضمناً یہ بتا دینا ضروری ہے کہ چند برس بعد یہی خطوط ایک ہفت روزہ میں چھپ گئے۔ بڑی

لے دے ہوئی۔ مگر میں نے کراچی کے روزنامہ ''حریت'' میں متعلقہ نقاد صاحب کا باقاعدہ دفاع کیا اور لکھا کہ ہجرت کے فوراً بعد کسی ایک آدھ واقعے سے انھوں نے اہلِ پنجاب کے بارے میں یہ تاثر قائم کیا ہوگا ورنہ وہ تو سالہا سال سے پنجاب میں مقیم ہیں اور ان کے حلقۂ احباب میں پنجاب میں رہنے والے ہم بے شمار اہلِ قلم شامل ہیں۔ یوں یہ طوفان بہت حد تک رک گیا۔ اس واقعے سے متعلق ایک خوشگوار یاد یہ بھی ہے کہ 'نقوش'' میں ان خطوط کی اشاعت کو رکوانے اور ''حریت'' میں میری طرف سے نقاد صاحب کے دفاع سے متاثر ہو کر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے برادرِ اکبر قبلہ ابوالخیر مودودی صاحب ہر جگہ میری اتنی بھرپور تعریف کرتے تھے جس کا میں اس حد تک حقدار نہ تھا۔

ایک اور واقعہ ہمارے ایک مشترکہ دوست کا ہے۔ ان کا نام مولانا عبدالسلام ندوی تھا۔ کوہاٹ کے پٹھان تھے اور خان عبدالغفار خان کے معتقد تھے۔ طفیل صاحب نے جب کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا اور ساتھ ہی ''نقوش'' کی تعداد اشاعت میں اضافہ ہوا تو مولانا عبدالسلام ان کے دستِ راست ثابت ہوئے۔ دوڑ بھاگ کا ہر کام ان کے سپرد تھا اور وہ یہ کام اتنی لگن کے ساتھ کرتے تھے جیسے عبادت کر رہے ہیں۔ طفیل صاحب کو عمر بھر مولانا کے ل بے لوث تعاون کا پاس رہا۔ بعد میں مولانا انارکلی میں ایک ادارے ضیاء الدین لمیٹڈ سے منسلک ہوگئے۔ اس ادارے کا دفتر انارکلی میں ''فنون'' کے سابقہ دفتر کے امنے تھا چنانچہ مولانا سے روزانہ میری ملاقات رہتی تھی۔ وہ خلوصِ نیّت اور بے غرض محبت کی خوبصورت تجسیم تھے۔ ''فنون'' کی کتابت اور طباعت سے لے ر اس کی ترسیل تک کے مراحل کو اُنھوں نے یوں سنبھال رکھا تھا کہ میں اس رف سے قطعی طور پر بے فکر ہوگیا تھا۔ آخری عمر میں وہ شدید بلڈ پریشر کے سبض ہوگئے۔ آخر انھیں یو۔ سی۔ ایچ۔ میں داخل کرایا گیا۔ افاقہ ہُوا اور انھیں

ہسپتال سے فارغ کیا جانے لگا تو میں خاصی رقم کا بندوبست کر کے ہسپتال پہنچا تاکہ ہسپتال کا بِل ادا کرسکوں۔ اتنے میں طفیل صاحب بھی تشریف لے آئے اور مجھے الگ لے جا کر کہا۔ ''اگر چہ مولانا بعض وجوہ کی بنا پر مجھ سے کچھ روٹھے رہتے ہیں مگر مجھ پر ان کے بہت سے حقوق ہیں اور ہسپتال کا بل میں ادا کروں گا!'' میں نے اپنی جیب سے وہ رقم نکال کر دکھائی جو میں یہ بل ادا کرنے کے لیے لایا تھا۔ پھر عرض کیا ''چلیے یوں کرتے ہیں بل کی آدھی رقم آپ ادا کر دیجیے' آدھی ادا کرنے کی مجھے اجازت دیجیے۔'' مگر طفیل صاحب بضد رہے کہ وہ ساری رقم خود ادا کریں گے اور اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ اب طفیل صاحب اشاعتی دنیا کی ایک خوشحال شخصیت تھے اور وہ مولانا کو بآسانی نظرانداز بھی کر سکتے تھے مگر ان کا ضمیر زندہ تھا چنانچہ مولانا کی یہ ننھی سی خدمت کر کے انھوں نے بڑی روحانی آسودگی محسوس کی۔

میں نے ۱۹۶۳ء میں ''فنون'' جاری کیا تو میرے پاس آئے اور کہا ''یہ آپ نے کوئی الگ رسالہ نہیں نکالا' ''نقوش'' اور ''فنون'' طفیل اور ندیم کی طرح دو بھائی ہیں اور جس طرح ہم دونوں نے زندگی کے نشیب و فراز میں رفاقت کا حق ادا کیا ہے' اسی طرح ''نقوش'' اور ''فنون'' بھی ادب کی دنیا کے مثالی رفقائے کار ثابت ہوں گے۔'' اور طفیل صاحب نے ''فنون'' کی تعمیر میں میرے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا۔

مجھے دکھ ہے کہ میں ان کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا۔ انتقال سے چند ماہ پہلے ایک جگہ ملاقات ہوئی تو بولے 'آپ کسی روز ''نقوش'' کے دفتر تشریف لائیے نا! اب اس کا دفتر نقوش پریس کی اوپر کی منزل میں منتقل ہوگیا ہے جہاں نیو مسلم ٹاؤن میں منتقل ہونے سے پہلے میں اپنے بال بچوں کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ دراصل میں آپ کو اُس کرسی پر بٹھا کر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں آپ مجھے بٹھا

گئے تھے!" ---- میں ان کے اس بالواسطہ اظہارِ محبت اور اعترافِ رفاقت سے بے حد متاثر ہوا اور وعدہ کیا کہ کسی روز ضرور آؤں گا۔ انتقال سے چند ہی روز پہلے انھوں نے ایک تقریب میں پھر سے یہی فرمائش کی اور میں نے پھر سے وعدہ کر لیا مگر ارادے کے باوجود یہ وعدہ پورا نہ کر سکا اور وہ وعدوں کے پورا ہونے یا نہ ہونے کی اُلجھنوں سے آزاد ہو گئے۔

ہماری مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
مجروح سلطان پوری شخص اور کلام	ڈاکٹر محمد فیروز	350/=
میر مہدی مجروح حیات اور تصانیف	ڈاکٹر محمد فیروز	250/=
بزم خوش نفساں	شاہد احمد دہلوی	140/=
منٹو نوری نہ ناری	ممتاز شیریں	100/=
اردو ادب کی ایک صدی	ڈاکٹر سید عبداللہ	60/=
وجاہت علی سندیلوی شخصیت اور ادبی آثار	ظفر احمد نازی	200/=
لندن کی ایک رات خصوصی مطالعہ اور تجزیہ	سجاد ظہیر / ڈاکٹر محمد فیروز	40/=
	لائبریری ایڈیشن	120/=
فن تضمین نگاری تنقید و تجزیہ	ڈاکٹر شیخ عقیل احمد	200/=
مخدوم پانچواں مینار	پروفیسر امیر عارفی	120/=
قاضی عبدالغفار شخصیت اور فن	پروفیسر امیر عارفی	175/=
غزل کا عبوری دور	ڈاکٹر شیخ عقیل احمد	150/=
موازنہ انیس و دبیر مطالعہ محاسبہ تقابل	ڈاکٹر ارشاد نیازی	200/=
لحاف اور دیگر افسانے	عصمت چغتائی	150/=
جانگلوس جلد اول	شوکت صدیقی	240/=
جانگلوس جلد دوم	شوکت صدیقی	300/=
دنیا گول ہے	ابن انشاء	95/=
نگری نگری پھرا مسافر	ابن انشاء	60/=
گرد کارواں	کنہیا لال کپور	40/=
سودیشی ریل	شوکت تھانوی	50/=

سعادت حسن منٹو کی کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
نیلی رگیں	95/=	آتش پارے اور سیاہ حاشیے	45/=
پھندنے	70/=	کالی شلوار	35/=
دھواں	50/=	منٹو کے مضامین	75/=
خالی بوتلیں خالی ڈبے	40/=	اوپر نیچے اور درمیان	60/=
رتی ماشہ تولہ	50/=	سرکنڈوں کے پیچھے	60/=

عقابی